Registered No. L. 4186

ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ

جلد ۱۳ - عدد ۶

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہٗ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ملتان روڈ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت ہمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا بہت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰/ محصول ڈاک ۲/ خرچ وی پی ۳/

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

فہرست مضامین

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۹ء جلد ۱۳، عدد ۶

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر، گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر

دفتر ترجمان القرآن، ملتان روڈ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں کچھ مدت سے ایک مسودۂ قانون زیر بحث تھا جس میں مسلمان عورتوں کے لیے فسخ وتفریق کی کچھ آسانیاں تجویز کی گئی تھیں۔ اگرچہ اس مسودۂ قانون میں متعدد نقائص تھے، اور اب کہ وہ آخری بار اسمبلی میں منظور ہو کر نکلا ہے، اس کے نقائص پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں لیکن ہم نے اس پر کسی قسم کا اظہار رائے نہیں کیا۔ اس بنا پر نہیں کہ ہمیں عورتوں کی اصلاح حال سے، یا قانون اسلامی کے صحیح و مکمل نفاذ سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ محض اس بنا پر کہ ہم کسی مجلس قانون ساز کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ شریعت اسلامی کی دفعات کو نافذ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے، یا قانونِ شریعت کی دفعات پر اس حیثیت سے بحث کرے کہ ان میں کیا چیز مناسب ہے اور کیا غیر مناسب، اور کسے نافذ کیا جائے اور کسے نہ کیا جائے۔ یہ حق خود مسلمانوں کی اپنی بنائی ہوئی کسی اسمبلی کو بھی نہیں ہے، کجا کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی اسمبلی کو حاصل ہو، اور وہ بھی ایسی اسمبلی جس میں غیر مسلم اکثریت کے ووٹوں پر فیصلہ کا مدار ہو۔ قانون اسلامی کے متعلق اس قسم کے مسودات موجودہ حکومت کی بنائی ہوئی مجالس قانون ساز میں پیش کرکے خواہ چھوٹے چھوٹے فوائد کتنے ہی حاصل کر لیے جائیں، مگر سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بھاری نقصان اس سے یہ پہنچتا ہے کہ ہم خدا اور اس کے رسول کے مقابلہ میں واس اور راے اور اپنی کے حق تشریع کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمام دنیا کے فوائد اس نقصان عظیم کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں کا تباہ ہو جانا اور ان کی ہستی کا مٹ جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ مسلمان قرآن اور سنت کے احکام و قوانین کو غیر مسلم قانون سازوں کے سامنے نقد و تبصرے کے لیے پیش کریں، اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگیں کہ اس قانون کی ـــــ جسے ہم قانون الٰہی بھی ساتھ ہی ساتھ کہتے جاتے ہیں ـــــ فلاں

فلاں فلاں کو ہمارے لیے قانون بنادو۔ پھر وہ منظر جبکہ ایک طرف مسلمان یہ بھیک کا ہاتھ پھیلائے ہوئے ہو، اور دوسری طرف وہ غیر مسلم لیجسلیٹر جو فیصلہ کا اختیار رکھتا ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے شرعی قانون میں کانٹ چھانٹ کر رہا ہو، حقیقۃً ایسا منظر ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنے سے پہلے مسلمان کا ڈوب مرنا زیادہ بہتر ہے!

یہ معاملہ کچھ اس قدر ایمان سوز اور غیرت شکن ہے کہ اس پر قلم اٹھاتے ہوئے روح کو اذیت ہوتی ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ عامیوں سے لے کر علمائے کرام تک نے اس مسودۂ قانون کو اسمبلی کے سامنے پیش کرنے میں دلچسپی لی ہے، اور اس پر اس طرح زور دیا ہے کہ گویا دین و دنیا کی فلاح اسی پر منحصر تھی، تو دل پر پتھر رکھ کر جی چاہتا ہے کہ اس آخری منظر کا نقشہ یہاں کھینچا جائے جو مسودہ کی منظوری سے پہلے ۱۴ فروری کو اسمبلی میں دیکھا گیا، شاید کہ اسی سے مسلمانوں کی سوئی ہوئی غیرت میں کچھ حرکت پیدا ہو۔

مولوی سید مرتضیٰ صاحب نے ترمیم پیش کی کہ خلع اور فسخ و تفریق کے مقدمات صرف مسلمان جج ہی کے سامنے پیش ہونے چاہئیں۔ اس پر حکومت ہند کے رکن قانون سر این این سرکار نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> "مگر انتظامی مشکلات سے قطع نظر، حکومت ہند اس اصول ہی کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک خاص فرقہ کے مقدمات کی سماعت اسی فرقہ کے جج کیا کریں۔ اس سے دوسرے فرقوں کے ججوں کی عدالتی راستبازی پر حرف آتا ہے۔"

اس کے معنی و مفہوم پر غور کیجیے۔ جو حکومت اس اصول کو خود قائم کرتی رہی ہے کہ انگریز کے مقدمہ کی سماعت خود ہز میجسٹی کا مامور کردہ غیر انگریز جج بھی نہیں کر سکتا، جس حکومت نے اپنے حدود مملکت ہی میں نہیں بلکہ ٹرکی اور مصر اور چین کی حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں بھی مدتوں یہ اصول تسلیم کرایا کہ انگریزی قومیت والوں کے مقدمات غیر انگریزی عدالتوں میں پیش نہیں ہو سکتے، وہی حکومت ہم سے کہتی ہے کہ تمہارے شرعی مقدمات کے بارے میں یہ اصول تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ تمہاری ہی شریعت پر ایمان رکھنے والے ان کی سماعت کریں! تم کو اپنی عورتوں کے نکاح فسخ کرنے

اور تفریق بین المرء وزوجہ کے نازک معاملات بھی غیر مسلم ججوں کے سامنے پیش کرنے پڑیں گے، چاہے وہ تمہاری شریعت پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور تعلقات زن و مرد کے متعلق ان کے نظریات تمہاری شریعت کے نظریات سے بالکل مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر تمہاری شریعت یہ کہتی ہے کہ فسخ نکاح اور تفریق بین الزوجین قاضی شرعی کے بغیر جائز نہیں، تو کہا کرے۔ اگر تمہارے دین کی رو سے غیر قاضی کے فسخ و تفریق کا اعتبار نہیں، اور اس طرح عورت کا نکاح ثانی درست نہیں ہوتا تو ہمیں اس کی کیا پروا۔ جب تم خود اپنی شریعت کو ہمارے سامنے فیصلہ کے لیے پیش کر رہے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے خود ہی اپنے خدا اور رسول کے بجائے ہم کو شارع تسلیم کیا ہے۔ لہذا ہمارے اصول تمہاری شریعت پر مقدم ہیں۔ تمہاری شریعت تابع ہے اور ہمارے اصول متبوع!

کاش یہی جواب سُن کر اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی آنکھیں کھلتیں اور وہ اس مسودے کو لا ممبر کے منہ پر مار کر باہر نکل آتے۔

مگر اسمبلی کے مسلمان ممبر! یہ مردم شماری کے مسلمان، جن کو ہماری قوم اپنے ووٹوں سے منتخب کرکے، اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتی ہے۔ ان کی دینی حمیت کے نمونے تو بارہا دیکھے جا چکے ہیں۔ مگر کبھی مسلمانوں کو احساس ہی نہ ہوا کہ ہم کس نادانی کے ساتھ اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب، جناب آصف علی نے کانگریس پارٹی کی طرف سے اس ترمیم کی مخالفت کی۔ دوسرے بزرگ جناب عبدالقیوم نے فرمایا کہ "یہ ترمیم اصلاً غلط ہے۔ ملک میں پہلے ہی جو امتیازات (مثلاً ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلمان پانی) پھیلے ہوئے ہیں، ان کو قانون کی سرحدوں تک ہیں نہ پہنچا دینا چاہیے"۔ یہ دونوں حضرات نیشنلسٹ مسلم جماعت کے گلہائے سرسبد اور "متحدہ قومیت" کے علمبردار ہیں۔ یہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ مسلم و کافر کے امتیازات مٹنے کے بجائے اور بڑھیں، یہاں تک بڑھ جائیں کہ اسلامی شریعت کی تعبیر و تفسیر کا حق بھی غیر مسلم سے چھین لیا جائے! مسلمان عورت کا نکاح تک۔۔ غیر مسلم فسخ نہ کر سکے! "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کی طرح "ہندو شاستری" اور "مسلم قاضی" کی آوازیں بھی آنے لگیں!

یہ اس "متحدہ قومیت" کی تفسیر ہے جس کے متعلق ہم کو قرآن و حدیث کی سند سے بتایا جاتا ہے کہ خدا بھی اس پر راضی ہے اور رسول کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ "امۃ مع المومنین" والے معاہدہ کو پھر ذرا ملاحظہ فرمالیا جائے۔ کچھ اس قومیت کا پتہ نشان بھی وہاں ملتا ہے کہ نہیں؟

مسٹر ایّنگر کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر نے خوب کہا اور بالکل سچ کہا کہ:۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ان مقدمات کی سماعت کے لیے مسلمان جج پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ آپ خود ہی تو اسلامی پرسنل لا کے بجائے مجلس قانون ساز کا بنایا ہوا قانون وجود میں لارہے ہیں۔ آپ ایک غیر دینی مجلس سے اسلامی قانون کی تعبیر اور اس کے اطلاق کا تصفیہ کرارہے ہیں۔ اب اگر یہ مجلس قانون بنانے کا اختیار رکھتی ہے تو اس بات کا بھی اختیار رکھتی ہے کہ اس قانون کی تعبیر کا حق جن منصفوں کو چاہے دے، بلا اس لحاظ کے کہ ان کا عقیدہ کیا ہے"۔

یہ سیدھی اور صاف بات ایک غیر مسلم تو سمجھ گیا، مگر نہ سمجھے تو ہمارے وہ ماہرین قانون جنھوں نے مسودہ مرتب اور پیش فرمایا، اور وہ پیشوایانِ دین اور وہ علمبرداران حرّیت جنھوں نے انگریز کی قائم کی ہوئی غیر اسلامی مجلس آئین ساز کے سامنے اسلامی قانون کے نفاذ کی بھیک مانگنے کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ اس کی پرزور حمایت کی۔

میں مانتا ہوں کہ شریعت کے قوانین پوری طرح نافذ نہ ہونے سے ہمارے معاملات بگڑ رہے ہیں، ہماری معاشرت اور ہمارے تمدن کا نظام مختل ہو رہا ہے، ہمارے گھر تک خراب ہو رہے ہیں۔ ہمیں شرعی قانون کے نفاذ کی بلاشبہ ضرورت اور سخت ضرورت ہے۔ مگر اس کی یہ کونسی صورت ہے کہ ہم خدا اور رسول کے قانون کو انگریز کی اسمبلی کے سامنے پیش کریں، اور وہ جانچ پڑتال کے لیے سلکٹ کمیٹی کے حوالہ کیا جائے، اور اس کی دفعات پر کوئی سرکار، کوئی اینی، کوئی آصف علی، کوئی عبدالقیوم رد و قدح کرے، اور ان کی تشریح کی

بنا پر نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی تشریع کی بنا پر وہ قانون، قانون بنے؟ چھوڑیئے غیرت اور حمیت کے سوال کو۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ سرکار اور یہ ایبی اور یہ آصف علی اور عبد القیوم ہوتے کون ہیں کہ یہ اسلامی قانون بنائیں اور ان کا بنایا ہوا قانون مسلمانوں پر اسلامی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو؟ اسلامی قانون تو وہی ہے جو صرف خدا اور اس کے رسول کی سینکشن سے قانون بنے۔ کسی عمر و زید کا بنایا ہوا قانون، خواہ اس کی دفعات لفظ بلفظ اسلامی قانون سے ملتی ہوئی کیوں نہ ہوں، اسلامی قانون نہیں ہو سکتا، جبکہ اس کا قانون ہونا خدا اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی سینکشن پر مبنی ہو۔ غیر مسلم جج نہ سہی، مسلمان جج بھی اگر مقرر کر دیا جائے تو وہ بھی ایسے قانون کی رو سے مسلمان عورت کا نکاح فسخ نہیں کر سکتا۔ مسلمان عورت خدا کے قانون کی رو سے مسلمان مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ غیر اللہ کا قانون اس کو اس مرد کے لیے حرام اور دوسرے مرد کے لیے کس طرح حلال کر سکتا ہے؟ آپ پر جو مشکلات اور مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں وہ غیر اسلامی نظام کی اطاعت قبول کرنے کی قدرتی پاداش ہیں۔ اس سزا سے بچنے کے لیے اگر آپ غیر شارع کو شارع کا منصب دیں گے تو یہ اسی قسم کی حرکت ہوگی جیسے کوئی شخص ٹپکے کی مصیبت سے بچنے کے لیے چھت ہی گرا دے۔ ایک گناہ کی سزا سے بچنے کے لیے دوسرا گناہ اور عظیم ترین گناہ کرنا بچاؤ کی صورت نہیں ہے بلکہ اور زیادہ بربادی کی صورت ہے۔ بچاؤ کے سارے راستے بند ہیں۔ صرف ایک راستہ کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام کو مٹا کر اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے جنگ کیجیے، اس کے لیے جیل جائیے، اس کے لیے لاٹھیاں کھائیے اس کے لیے سر تک دے دیجیے۔ تمام قربانیوں کا مستحق یہی ایک مقصد ہے اور باقی سب چھوٹے مقاصد ہیں۔

خدا اور اس کے رسول کے احکام سے بغاوت کی وبا مسلمانوں کی جماعت میں جس حد تک پہنچ چکی ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیجیے جو ابھی پچھلے ہی مہینہ میں پیش آیا ہے۔ اگرچہ جسم قومی کے ان ناصوروں کو بار بار دکھانا نہ میرے لیے خوشگوار ہے، نہ ان کو دیکھنا برادرانِ دینی ہی کے لیے خوشگوار

ہوسکتا ہے، مگر کیا کیجیے کہ یہ ناسور ہیں موجود، اور روز افزوں شدت کے ساتھ رس رہے ہیں، اس لیے آنکھیں بند کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ انھیں دکھانا اور بار بار دکھانا چاہتا ہوں کہ پورے جسم کے سڑنے سے پہلے مسلمان اُن کی طرف متوجہ ہوں۔

ریاست کپورتھلہ میں سلطان پور لودی ایک پرانا تاریخی مقام ہے جہاں ہمارے رفیق مستری محمد صدیق صاحب کچھ عرصہ سے مسلمانوں کو اقامتِ صلوٰۃ کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس تلقین و تبلیغ کے مقابلہ میں سب سے زیادہ جس خاندان نے انحراف و استکبار کیا وہ مقامی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب اور ان کا خاندان تھا۔ مستری صاحب نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار انھوں نے باہر کے لوگوں سے مدد مانگی۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی اور یہ عاجز، دونوں سلطان پور پہنچے اور ہم نے انتہائی نرم طریقے سے افہام و تفہیم کی، لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد جو اطلاعات مجھ تک پہنچیں وہ یہ ہیں کہ مستری صاحب نے حکم الٰہی کی تبلیغ برابر جاری رکھی، اور اس پر ان لوگوں کا استکبار یہاں تک بڑھ گیا کہ مار پیٹ پر اتر آئے۔ اِدھر سے نہایت عاجزی و مسکنت کے ساتھ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ کا حکم سنایا گیا اور اُدھر سے جواب میں ڈنڈے برسائے گئے۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ کیا اس حد کو پہنچ کر بھی کوئی شخص مسلمان رہ سکتا ہے؟ اوّل تو عادۃً ترکِ نماز خود ایک ایسا فعل ہے جس پر ایمان کے مسلوب ہو جانے کا ظن غالب ہوتا ہے۔ تاہم زمانہ کے بگڑے ہوئے حالات کی رعایت سے اس بارے میں حکم کو کچھ نرم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب فرض یاد دلایا جائے اور اس کا جواب صریح انکار سے دیا جائے، اور جب انکار پر اتنا اصرار ہو کہ فرمانِ الٰہی سنانے والے کو مارا جائے تو بتائیے کہ ایسے دل میں ایمان کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگ بھی مسلمان ہوں تو آخر نامسلمان کون ہوں گے؟

مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں ایسے ایک دو نہیں بکثرت لوگ شامل ہیں۔ کریدے نہیں گئے اس لیے ان کا حال چھپا ہوا ہے، اور محض گناہگار مسلمان ہی سمجھ کر چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اگر کریدے جائیں تو صاف

کھل جائے کہ شدید قسم کے منافق ہیں جو مسلمان کی حیثیت سے ہماری قوم میں شامل ہیں۔ مسلمانوں کی معاشرت میں گھسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں میں شادی بیاہ کر رہے ہیں۔ مسلمان بچوں کے معلم ہیں۔ قومی ادارات کے کرتا دھرتا ہیں۔ سیاسی مجالس میں قوم کے نمائندے ہیں۔ غرض ہر جگہ مسلمان کے طور پر لیے جا رہے ہیں۔ یہ نو کروڑ کا عظیم الشان جسم جو آپ کو نظر آ رہا ہے اس کا پھیلاؤ بڑی حد تک اسی آماس، اسی سوجن کا رہین منت ہے۔ اسی لیے جتنا اس جسم کا پھیلاؤ ہے اتنا اس میں زور نہیں ہے۔ سوجے ہوئے جسم کا موٹاپا قوت کا نہیں، الٹا ضعف کا سبب ہوتا ہے۔ مردم شماری کا یہ عدد کثیر دراصل ان منافقین کی تعداد کثیر ہی سے بنا ہے، اور اسی نے ہم کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہم اس تعداد کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اللہ اکبر! ہم ہندوستان میں نو کروڑ ہیں۔ بھلا اتنی بڑی قوم بھی کہیں بے بس اقلیت (HOPELESS MINORITY) ہو سکتی ہے۔ مگر سوچنے کا مقام ہے کہ "مسلمان" اور وہ بھی نو کروڑ کسی ایک ملک میں موجود ہوں، اور پھر ان کے دبدبے سے وہ ملک لرز نہ اٹھے، ان کے وزن سے اس ملک کا ہر ذرہ دب نہ جائے، یہ کہیں ممکن ہے؟ کہیں یہ بات تصور میں بھی آ سکتی ہے کہ "مسلمان" اتنی بڑی تعداد میں ہو کر بھی غلام ہوں، بے وزن اور بے اثر ہوں؟ یہ دراصل ممکن ہی اس وجہ سے ہوا کہ اس مردم شماری میں اکثریت منافقوں کی ہے۔ خدا کے قانون سے بغاوت کرنے والے اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کی کثرت ہے جن کو خدا کی اور اس کے قانون کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ یہ بھاری بھرکم تعداد ایسے بہت لوگوں پر مشتمل ہے جو مہاراجہ کپورتھلہ کے تو چپراسیوں تک کا حکم ماننے سے انکار نہیں کر سکتے اس لیے کہ وہاں سے روٹی بھی ملتی ہے اور جوتی بھی مل سکتی ہے، مگر خدا کے بڑے سے بڑے حکم کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں اس لیے کہ نہ وہ انھیں روٹی دیتا نظر آتا ہے، اور نہ انھیں اس سے کسی سزا کا خوف ہے۔ اس قسم کے منافقین کی کثرت ہی نے ہمیں اس قدر کمزور کیا ہے۔ اگر یہ سب کے سب ہماری جماعت سے نکل جائیں اور حقیقی مسلمان نو کروڑ نہیں ۹ لاکھ بلکہ اس سے بھی کم رہ جائیں تو خدا کی قسم ہمارا وزن موجودہ حالت سے بدرجہا زیادہ ہوگا اور ہم اب سے بہت زیادہ زور آور ہوں گے۔

مسلمانوں کو در حقیقت متبعین اسلام کی تعداد بڑھانے کی جس قدر ضرورت ہے اس سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ منافقین کی اس بھرتی سے اپنی جماعت کو صاف کر دیں۔ اِن کا نکلنا رحمت ہے اور ان کا شامل رہنا لعنت ہے۔ جن کی گردن خدا کے سامنے اکڑتی اور بندوں کے سامنے جھکتی ہے ان کی ہمیں قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم کو صرف ان کی ضرورت ہے جو خدا کے سامنے جھکنے والے اور سب کے سامنے اکڑنے والے ہوں۔ آنکھیں یہ دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں کہ جو لوگ قانونِ الٰہی سے کھلم کھلا باغی ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں میں شامل ہیں بلکہ اسلام کے نام سے فائدہ اٹھانے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ مسلم قوم کے نام پر حقوق لینے ہوں، روٹیاں حاصل کرنی ہوں، اعزاز اور مناصب اور کرسیاں طلب کرنی ہوں تو یہ درجۂ اوّل کے مسلمان لیکن اسلامی عقائد اور اسلامی احکام کی پابندی کے لحاظ سے دیکھیے تو کسی درجہ کے مسلمان بھی نہیں، بلکہ اسلام سے، اُس کے عقائد سے، اس کے احکام سے، اس کے شعائر سے غرض ہر چیز سے منحرف، اور صرف منحرف ہی نہیں بلکہ علی الاعلان باغی۔ اگر ان لوگوں میں کسی قسم کا اخلاقی احساس موجود ہوتا تو جس وقت یہ اپنے اندر یہ بات پاتے کہ اسلام کی اطاعت پر ان کا نفس آمادہ نہیں ہے، یا اسلام ان کے دل و دماغ میں نہیں اُترتا اُسی وقت اپنے غیر مسلم ہونے کا صاف اظہار کر دیتے اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے الگ ہو جاتے۔ اس صورت میں ہم ان کو کم از کم انسانی احترام کا مستحق تو ضرور سمجھتے۔ لیکن جو طریقہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ انہیں کسی عزت اور کسی احترام کا مستحق نہیں رکھتا اس لیے کہ منافق اور جاسوس کے لیے دنیا کے کسی قانون میں بھی کوئی حرمت نہیں۔ آزاد قوموں میں ایسے لوگوں کو پھانسی دی جاتی ہے۔ ہم آزاد نہیں تو کم از کم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان کو اپنی جماعت سے نکال باہر کریں، چاہے یہ ہمارے بھائی بند اور عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں

اسلام باپ سے بیٹے کو نطفہ میں نہیں ملتا کہ جو مسلمان کے گھر پیدا ہو وہ لامحالہ مسلمان ہی ہو۔ اسلام کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جس طرح انگریز بہر حال انگریز رہتا ہے خواہ اس کے عقائد اور اصول حیات کیسے ہی

ہوں، اسی طرح مسلمان بھی بہر حال مسلمان ہی رہے، خواہ وہ قرآن کی تعلیم اور اس کے احکام کا متبع ہو یا نہ ہو۔ جن لوگوں نے مسلمان کے معنی یہ سمجھے ہیں، اور اس بنا پر وہ اسلام سے باغی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نہ صرف مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں بلکہ مسلم قومیت کے علمبردار اور حقوق مسلمین کے وکیل بھی بنتے ہیں، میں ان سے صاف کہتا ہوں کہ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اسلام محض ایک عقیدہ، ایک مسلک اور ایک نظامِ زندگی ہے۔ جو اس کی صحت و صداقت پر ایمان لا کر اس کا اتباع کرتا ہے وہی مسلمان ہے، اور جو اعتقاداً و عملاً اس کا متبع نہیں وہ مسلمان بھی نہیں۔ اس کا باپ اگر اس مسلک کا پیرو تھا تو ضرور وہ مسلمان تھا لیکن اگر وہ خود اس کا پیرو نہیں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے اور مسلمانوں کی جماعت میں اس کا شامل رہنا سراسر ایک جعل ہے۔ مارکس یا لینن کی اولاد اگر سوشلزم کی معتقد نہ ہو تو آپ انہیں محض اس بنا پر سوشلسٹ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا باپ سوشلسٹ تھا۔ میسولینی کا بیٹا اگر فاشزم کا معتقد نہ ہو تو آپ اسے فاشسٹ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ میسولینی کا خون چاہے اس کو نطفہ میں ملا ہو مگر فاشزم تو نہیں ملا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام بھی جب اسی طرح ایک نسلی چیز نہیں بلکہ شعوری اور مسلکی چیز ہے، تو ان لوگوں کو مسلمان کہا جائے جو مسلمان ماں باپ کی اولاد ضرور ہیں مگر نہ اپنے شعور کے اعتبار سے مسلمان ہیں اور نہ مسلک کے اعتبار سے۔ اسی بنا پر تو قرآن نے حضرت نوح کے بیٹے پر اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ کا حکم لگایا ہے۔

اگر کسی دوکان پر آپ "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں، یا کسی سوسائٹی کا نام "اشتراکی مہاجنوں کی جماعت" سنیں تو یقیناً آپ کو یہ چیز مضحکہ انگیز معلوم ہوگی، کیونکہ یہ صریح تناقضِ بیان (CONTRADIC-TION IN TERMS) ہے۔ لیکن آپ "اسلامی بینک" اور "اسلامی انشورنس کمپنی" جیسے نام سنتے ہیں اور آپ کو ہنسی نہیں آتی، اور نہ اس میں آپ کو کسی قسم کا تناقض محسوس ہوتا ہے۔ آخر اس بے شعوری کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ اسلام کے متعلق آپ کا تصور بالکل غلط ہے۔ آپ مسلمان زادے کو لازماً مسلمان سمجھتے ہیں، اور پھر

یہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ آپ کے نزدیک "اسلامی" ہوتا ہے، خواہ وہ اصول اسلام کی عین ضد ہی کیوں نہ ہو۔ کچھ بعید نہیں کہ اس بے شعوری کی بنا پر آپ رفتہ رفتہ اسلامی شرابخانہ، اسلامی قحبہ خانہ، اسلامی قمار خانہ، اسلامی رقص گاہ وغیرہ ناموں کو سننے اور قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں!

مسلمانوں کی زندگی میں ہر طرف یہی تناقض مجھے نظر آ رہا ہے۔ ایک صاحب کسی ہوٹل میں بیٹھ خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر پھر بھی مسلمان ہیں۔ دوسرے صاحب مارکس پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے متعلق خود کہتے ہیں کہ میرے دماغ میں نہیں سماتی۔ مگر یہ بھی مسلمان ہیں۔ تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں جانتے مگر یہ بھی مسلمان۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحب یا شریمتی بنائے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبزادی سے وایولین بجوا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ بھی لفظ مسلمان بدستور چپکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذاتِ شریف کے لیے نماز روزہ، حج زکوٰۃ سب حرام اور شراب زنا سود اور ایسی ہی سب چیزیں حلال، اسلام اور اس کی تعلیمات کے متعلق ایک حرف نہیں جانتے، زندگی دیکھیے تو ان میں اور ایک ہندو یا عیسائی یا پارسی کی زندگی میں رتی برابر فرق نہیں، مگر ان کو بھی مسلمان ہی کہا جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے آپ اپنی جماعت کا جائزہ لیں گے تو اس میں بھانت بھانت کا "مسلمان" آپ کو نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ اس کا شمار نہ کر سکیں گے۔ اسلام کے گھر کو ایک چڑیا گھر سمجھ لیا گیا ہے کہ جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔ خدارا کوئی بتائے کہ یہ آخر کیا مذاق ہے، اور کب تک جاری رہے گا؟ کیوں نہ ہم اس چڑیا گھر کو توڑ دیں تاکہ اس "چڑیائی" قومیت کا خاتمہ ہو جائے اور ہر چڑیا اپنی اپنی جنس سے جا ملے؟ یہ ناجنسوں کا اجتماع آخر کس معنی میں ہمارے لیے مفید ہے؟

ابھی ایک صاحب کا خط میرے پاس آیا ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی مشہور لیڈر کے ساتھ اپنی گفتگو کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ یہ لیڈر صاحب ہمارے قومی حقوق کے علمبردار اکبر ہیں، اور اس حیثیت سے ان کو مسلم اکبر ہونا چاہیے تھا مگر خیالات یہ ہیں کہ سیاست اور مذہب کو الگ ہونا

چاہیے، اور دلیل میں سند لاتے ہیں کمال اتاترک کی سنت سے۔

میں نے مراسلہ نگار کو جواب دیا کہ اپنے ان لیڈر صاحب سے کہہ دیجیے کہ تم جاہل ہو اور تمہارے وہ ائمہ جن کی سنت کا تم اتباع کر رہے ہو، تم سے بڑے جاہل تھے۔ ہو سکتا ہے کہ تم کسی دوسری چیز کے عالم بلکہ ماہر ہو، مگر اسلام میں تمہاری حیثیت یقیناً جاہل مطلق کی سی ہے۔ تم کہتے ہو کہ سیاست کا تعلق اسلام سے کاٹ دیا جائے۔ بہت اچھا۔ مان لیا کہ کاٹ دینا چاہیے۔ مگر بتاؤ کہ زندگی کی کس چیز کا تعلق تم اسلام سے قائم رکھنا چاہتے ہو؟ تمدن و معاشرت کا؟ معاشی معاملات کا؟ اخلاق و آداب کا؟ تعلیم کا؟ اجتماعی قوانین کا؟ ایک ایک چیز کے حق میں تمہارا یہی فیصلہ ہے کہ اسے بھی کاٹو، اور عملاً تم کاٹ چکے ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بھی اسلام سے الگ کر دی جائیں۔ اچھا اب اُن چیزوں کے متعلق کہو جن کو تم کہتے ہو کہ یہ مذہب میں ہیں۔ عقائد؟ ان کے متعلق تم کہتے ہو کہ خیالاتِ جدید (MODERN THOUGHT) معیارِ حق ہیں۔ جو باتیں ان کے مطابق ہیں وہ تو اسلام میں رہیں اور جو ان کے خلاف ہیں وہ نکالی جائیں یا بدلی جائیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اگر تم سے پوچھا جائے کہ اسلام میں کیا چیزیں خیالاتِ جدید کے موافق ہیں، وہی بتا دیجیے؟ تو تم اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے، حتیٰ کہ اسلام کے متعلق تم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ اسلام وہی ہے جو کہ اسلام ہے! اس کے بعد احکام اور فرائض کا سوال سامنے آتا ہے۔ ان میں سے کس چیز کی پابندی کے لیے تم تیار ہو؟ نماز کی؟ روزہ کی؟ حج کی؟ زکوٰۃ کی؟ کسی چیز کی پابندی کے لیے بھی تم تیار نہیں۔ درحقیقت ان کو تم فرض ہی نہیں جانتے۔ اچھا نکاح؟ اس باب میں تمہارا فتوے یہ ہے کہ یہ کوئی مذہبی چیز نہیں۔ محض ایک تمدنی معاملہ ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ اور اس دائرے سے نکل کر بھی کچھ خوش طبعی کر لی جائے تو دقیانوسی خیالات کی پیروی نہ کرنی چاہیے کہ اس پر ناک بھوں چڑھائی جائے۔ اب ارشاد ہو کہ یہ سب چیزیں نکل جانے کے بعد اسلام ہے کیا چیز؟ اس میں رہ کیا جاتا ہے؟ فقط نام؟ یہ اسم بے مسمیٰ ہے جس کے علمبردار بن کر آپ اٹھے ہیں؟ اس نام کے لیے ہم دنیا بھر سے لڑائی مول لیں؟ اس کے لیے ہم ہر ایک قوم سے الگ اپنی جمعیت بنائیں؟ اس کے لیے تمہارے جلوس نکالیں اور تمہیں جھنڈے پر چڑھائیں؟ یہ تمہاری چیخ پکار اور یہ تمہاری بلند آہنگیاں اسی بے معنی شے کے لیے ہیں؟

یہ لوگ علم سے تو محروم ہیں ہی۔ مگر ان غریبوں کو معمولی عقل عام سے بھی کوئی بہرہ نہیں ملا۔ یہ سوشلسٹ سے نہیں کہہ سکتے کہ تو سوشلزم کو سیاست اور معیشت اور تمدن سے الگ کر دے۔ یہ نازی اور فاشسٹ سے نہیں کہہ سکتے کہ تو نازیت اور فاشزم

کا تعلق تمدنی نظریات اور سیاسی اور معاشی معاملات سے کاٹ دے۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی تجویز پیش کی جائے تو یہ خود اس پر قہقہہ لگائیں گے اور کہیں گے کہ تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ غیر معقول بات تمہارے ذہن میں آئی کیسے کہ سوشلسٹ کی سیاست یا اس کی معیشت سوشلزم سے الگ ہوجائے؟ ان چیزوں کی نفی خود سوشلزم کی نفی ہے، اور سوشلسٹ ان کی نفی قبول کرکے سوشلسٹ رہ کیسے سکتا ہے؟ وہ جب دوسرے کسی نظام کے اصول اور نظریات اختیار کرے گا تو غیر سوشلسٹ ہوجائے گا۔ آپ جب چاہیں اس قسم کی کوئی تجویز ان کے سامنے پیش کرکے دیکھ لیں۔ ان کی طرف سے جو جواب میں دے رہا ہوں، لفظ بلفظ یہی جواب خود ان کے منہ سے آپ سن لیں گے۔ مگر یہ عقل کے دشمن جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، سوشلسٹ اور نازی اور فاشسٹ کی پوزیشن تو سمجھ لیتے ہیں، البتہ مسلمان کی پوزیشن نہیں سمجھ سکتے۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ سیاست میں غیر مسلم، معیشت میں غیر مسلم، تمدن و معاشرت میں غیر مسلم، اخلاق اور قانون میں غیر مسلم، افکار اور نظریات میں غیر مسلم، عقائد اور اعمال میں غیر مسلم ہونے کے بعد آدمی مسلم کیسے ہوسکتا ہے؟ اسلام جن عناصر سے مرکب ہے وہ سب نکل جائیں اور پھر اسلام بدستور قائم کا قائم رہے۔ مسلم جن خیالات کے معتقد اور جن اصولوں کے پیرو کا نام ہے وہ سب اس سے سلب کرلیے جائیں اور پھر وہ مسلم بھی کہلائے۔ کیسی متناقض بات ہے؟ ان لوگوں کا دماغ خراب نہیں ہوا تو اور کیا ہوا ہے کہ یہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو غیر مسلم ہوجا اور پھر مسلمان بھی رہ؟

یہ ان لوگوں کا حال ہے جو مسلمانوں کی کشتی کے کھویا بنے ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ! ایسا وقت آنا بھی ہماری قسمت میں لکھا تھا کہ گندے پانی کے نہنگ کشتی اسلام کے ملاح بنیں۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

عجیب فتنہ کا دور ہے۔ جو زبانیں اس لائق بھی نہ تھیں کہ اسلام کا پاک نام لے سکیں وہ اس کی وکیل، اس کی نقیب اور اس کی حمایت کی ذمہ دار بنی ہیں۔ منافق افراد سے قوم بھری ہوئی ہے۔ رؤسائے منافقین رہنمایانِ قوم بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کا علم رکھنے والے اور دعویداری کرنے والے... پوشوں پر "قومیت متحدہ" کا بھوت سوار ہے۔ ان کی غیرتِ ایمانی اتنی سرد ہوچکی ہے کہ کفار کو اپنا امام ماننے میں بھی تامل نہیں کرتی۔ اب خدا کے سوا کون ہے جس سے فریاد کی جائے۔ یا تو وہ ہمیں اس ناپاک دنیا سے اٹھا لے، یا پھر اپنی طاقت بخشے کہ ان ساری فتنوں کا سر کچل ڈالیں۔

مقالات

جواہرِ حکمت

از افادات علامہ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ

[علامہ حافظ ابن عبدالبر کا نام کسی صاحب علم کے لئے تعارف کا محتاج نہیں، اور نہ آپ کا مقامِ علم و اجتہاد کسی پر مخفی ہے۔ آپ کا شمار ائمہ سلف کی صفِ اول میں ہے۔ فقیہ اور مجتہد بھی ہیں اور حافظِ حدیث بھی۔ علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اربابِ نظر ان کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ وسعت نظر، عالمانہ تبحر اور تفقہ فی الدین کے مسلم امام ہیں۔ اندلس کی خاک سے ایسا خادم شریعت شاید ہی کوئی اور اٹھا ہو۔ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۵ ربیع الآخر ۳۶۸ھ یوم پیدائش ہے۔ اپنے وطن ہی کے مشہور اہلِ علم سے استفادہ کیا۔ علم کے لئے اندلس سے باہر کبھی نہیں گئے لیکن احفظ اهل المغرب تسلیم کئے گئے ہیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر جلاوطن بھی کئے گئے۔ کچھ دنوں مغربی حصوں میں رہے، پھر شرقی اندلس میں چلے آئے۔ خلیفہ مظفر کے زمانہ میں اشبونہ کے قاضی رہے۔ ربیع الآخر ۴۶۳ھ میں وفات پائی۔ متعدد تصنیفیں چھوڑی ہیں جن میں سے ایک مشہور تالیف "جامع بیان العلم" ہے۔ اسی سے ہم بعض مفید حصوں کا اقتباس درج کرتے ہیں۔]

تقلید اور اتباع کا فرق ابوعبداللہ بن خویز منداد البصری المالکی فرماتے ہیں:۔

"شرع میں تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسے قول کی پیروی کی جائے جس کی دلیل صحت پر مقلد کو اطلاع نہ ہو۔ یہ تقلید شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہے۔ اور اتباع ایسے قول کی پیروی کو کہتے ہیں جو

دلیل و حجت سے ثابت ہو۔"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :-

"اگر تم کسی شخص کے قول کی اقتدار دلائل کی قوت کے بجائے محض حسنِ ظن کی بنا پر کرتے ہو تو تم اس کے مقلد کہے جاؤ گے اور اللہ کے دین میں تقلید ممنوع ہے۔ اور اگر تم کو حجت و برہان کی طاقت نے کسی قول کی پیروی پر مجبور کر دیا ہے تو تم اس کے متبع کہلاؤ گے۔ اتباع، شریعتِ الٰہی میں جائز ہے بخلاف تقلید کے۔"

مقاصدِ تقلید نقلی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اتاری ہوئی کتاب میں جگہ جگہ تقلید کی مذمت کی ہے۔ عدی ابن حاتم دربارِ رسالت میں ایک بار حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلعم سورہ براءت کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" پر پہنچے تو عدی ابن حاتم نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم نے تو اپنے علماء و مشائخ کو کبھی نہیں پوجا۔ آپ نے فرمایا "کیوں نہیں۔ کیا وہ لوگ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو تمھارے لئے حلال نہیں کر دیا کرتے تھے اور تم بلا دلیل و حجت انہیں حلال سمجھ لیتے تھے؟ اسی طرح کیا وہ خدا کی حلال ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں کر دیتے تھے اور تم بے چون و چرا انہیں حرام مان لیتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا "ہاں یہ تو صحیح ہے" حضور نے فرمایا تلك عبادتهم "یہی ان کی عبادت ہے۔"

اسی اندھی تقلید کی داستان ایک مقام پر قرآن یوں بیان کرتا ہے :-

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ الخ	اور اسی طرح تم سے پہلے جس ڈرانے والے (نبی) کو بھی ہم نے کسی قریہ میں بھیجا اس قریہ کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے تو اپنے بڑوں کو ایک رستے پر پایا ہے اور ہم تو انھیں کے نقش قدم کی پیروی کریں گے۔

گویا محض تقلیدِ آبا نے انھیں ہدایت قبول کرنے سے روکا۔ اور آخر کار انھوں نے صاف صاف کہہ دیا

کہ ہم تمہاری تعلیم کو کبھی نہیں مان سکتے اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بت پرستوں سے مذمت اور تحقیر کے انداز میں فرماتے ہیں کہ :-

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۔ یہ مورتیاں کیسی ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟

تو جواب میں وہ بس یہی دلیل دیتے ہیں کہ :-

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

اسی طرح بیشمار آیتوں میں اس آبا پرستی اور اکابر قوم کی کورانہ تقلید کی مذمت کی گئی ہے۔ اگرچہ ان آیتوں میں جن مقلدوں کی مذمت بیان کی گئی ہے وہ کفار میں سے ہیں اور امت اسلامیہ کے مقلدین اہل ایمان میں سے ہیں۔ یہ فرق ضرور ہے لیکن اس کے باوجود علماء نے انہی آیتوں سے ابطالِ تقلید پر استدلال کیا ہے۔ ان کے نزدیک دونوں گروہوں میں وجہ مشابہت کفر و ایمان نہیں ہے، بلکہ یہ مشابہت دونوں تقلیدوں کی نوعیت کے لحاظ سے ہے۔ یعنی جس طرح پہلی قسم کے مقلدین کا گناہ یہ تھا کہ وہ دلیل و حجت کے بغیر اپنے پیشواؤں اور اپنے اسلاف کی تقلید کرتے تھے اسی طرح یہ دوسری قسم کے مقلدین بھی کسی طریقہ کی پیروی کے لئے خدا کی کتاب اور رسول کی ہدایت سے دلیل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ مجرد ایسے لوگوں کے قول کو سند اور حجت سمجھتے ہیں جن کے ساتھ انہیں حسنِ ظن ہے۔ یہ فرق ضرور ہے کہ ایک شخص تقلید کرتا ہے اور انجام کار کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسرا تقلید کرتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا کسی معمولی دنیوی مسئلہ میں تقلید کر کے خطا میں پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا انجام جدا جدا ہوا مگر اس لحاظ سے تو مساوی ہیں کہ ان کے مبتلائے غلط ہونے کی علت ایک ہے، یعنی غیر نبی پر اعتمادِ تام، اور کسی ایسے شخص کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنا جس کے پاس خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں آتا۔

رسول اللہ صلعم نے ایک بار فرمایا کہ میں اپنے بعد اپنی امت کے لئے اس کے تین اعمال سے اندیشناک

ہوں" پوچھا گیا یا رسول اللہ وہ اعمال کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا" عالم دین کی لغزش، ظالم بادشاہ کی حکمرانی اور خواہش نفس کی پیروی"۔

ابو العالیۃ الریاحی سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا" عالم کی لغزشوں سے متبعین کے لئے بڑی خرابی ہے" لوگوں نے کہا اس کی توضیح فرمائیے۔ جواب دیا:۔

"ایک عالم اپنی رائے سے ایک بات کہتا ہے، پھر کسی بڑے عالم بالسنۃ کو پاتا ہے اور اس سے شریعت کا صحیح حکم سن کر اپنے قول سے رجوع کر لیتا ہے۔ مگر جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں انہیں اسکے رجوع کی کیا خبر؟ وہ تو اسی پہلے قول کی پیروی کئے چلے جائیں گے جس سے وہ رجوع کر چکا ہے"۔

حکماء نے عالم کی غلطی کو کشتی کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ جب وہ ڈوبتی ہے تو اپنے ساتھ ایک کثیر جماعت کو بھی غرق کر دیتی ہے۔ یہی حال عالم کا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت معاذؓ بن جبل نے فرمایا کہ لوگو! تم تین چیزوں کے ساتھ کیا کرو گے؟ دنیاؔ، جو تمہارے لئے سراپا ہلاکت ہے۔ عالم کی لغزشؔ۔ اور منافق کا قرآن سے استدلالؔ۔ یہ سوال سن کر سب لوگ خاموش رہے۔ پھر حضرت معاذ نے خود ہی جواب دیا:۔

"پہلے عالم کو دیکھو۔ عالم اگر ہدایت کی سیدھی شاہراہ پر ہے تو جوشِ عقیدت میں تمہیں نہ چاہیئے کہ اپنا دین اس کے سپرد کر دو (یعنی اس کی اندھی تقلید کرنے لگو)۔ اور اگر وہ شاہراہِ ہدایت سے ہٹا ہوا ہے اور فتنوں کا شکار ہو گیا ہے تو اشتعال میں آ کر اس سے اپنے تعلقات بالکل منقطع نہ کر لو۔ کیونکہ مومن بھٹک کر تائب ہو جایا کرتا ہے..... الخ"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:۔

"دیکھو تم میں سے کوئی اپنے دین کی باگ کسی دوسرے انسان کے ہاتھ میں نہ دے کہ اگر وہ ایمان پر رہے تو تم بھی صاحبِ ایمان رہو اور اگر وہ گمراہ ہو گیا تو تم بھی اسی کے ساتھ گمراہ ہو جاؤ۔

شرع میں آنکھیں بند کرکے چلنے کا کام نہیں ہے۔"

محمدؒ بن حارث سے روایت ہے کہ مالک بن انس اور عبدالعزیز ابن ابی سلمہ اور محمد بن ابراہیم بن دینار وغیرہ ابن ہرمز کے پاس جایا کرتے تھے۔ جب مالک بن انس اور عبدالعزیز ان سے کسی مسئلہ کے متعلق استفسار کرتے تو وہ جواب دے دیتے لیکن جب کبھی ابن دینار وغیرہ کوئی سوال کرتے تو وہ خاموش رہتے۔ ایک دن ابن دینار نے ان سے کسی قدر ملول اور کبیدہ خاطر ہوکر پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ابن ہرمز نے جواب دیا کہ تمھیں میری اس روش سے برا نہ ماننا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میری ہڈیاں کمزور اور اعضاء مضمحل ہوگئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بدن کی طرح میری عقل و فہم بھی ضعیف اور مضمحل نہ ہوگئی ہو اور میں صحیح و حق جواب نہ دے سکوں۔ مالک اور عبدالعزیز عالمانہ نگاہ اور فقیہانہ بصیرت رکھتے ہیں۔ جب مجھ سے کوئی خلافِ حق بات سنیں گے تو اپنے علم و فہم کی کسوٹی پر پرکھ کر رد کر دیں گے لیکن تم لوگوں کا حال بالکل دوسرا ہے۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا، خواہ غلط ہو یا صحیح، سب قبول کر لوگے۔" محمد بن حارث یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم یہی دین کامل اور عقل راجح کی شان ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:۔

"ایک وقت آئے گا جب علماء ختم ہوجائیں گے اور لوگ کم سواد بڑوں سے مسائل شرعیہ میں رجوع کریں گے۔ وہ بغیر کسی علم و آگہی کے فتوے دیں گے، خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

سفیان ابن عُیینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ربیعہ لیٹے ہوئے مُنہ ڈھانک کر رو رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا کھلی ہوئی ریاکاری اور خفیہ نفس پرستی کا عام طوفان آیا ہوا ہے اور لوگ علماء کے ہاتھوں میں اس طرح پڑے ہیں جیسے شیر خوار بچے اپنی ماؤں کی آغوش میں کہ جس چیز سے علماء روکتے ہیں یہ اس سے رک جاتے ہیں اور جس چیز کا وہ حکم دیتے ہیں یہ بلاچون وچرا اسی کو کرنے لگتے ہیں۔

ایوبؒ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ:۔

"تم اپنے شیخ کی غلطی پر اس وقت تک مطلع نہیں ہو سکتے جب تک دوسرے علماء کی صحبت نہ اختیار کرو۔"

عبید اللہ ابن معتز فرماتے ہیں کہ :۔

"مقلد انسان اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں جس کی گردن کی رسی کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔"

یہ تمام نصوص اور اقوال تقلید محض کے بطلان پر شاہد ہیں، لیکن اس شہادت کے سننے اور سمجھنے کے لئے عقل و فہم کی ربانی توفیق درکار ہے۔

ابطالِ تقلید نظری حیثیت سے وجوب یا جواز تقلید کے قائل سے سوال یہ ہے کہ اس نے کس دلیل کی بنا پر اسے جائز یا واجب قرار دیا، اور کیونکر تمام سلف کے خلاف راہ اختیار کی؟ اس لئے کہ سلف صالح میں تو کسی سے بھی تقلید ثابت نہیں۔ اس سوال کے جواب میں اگر وہ یہ کہے کہ میں کتاب و سنت سے واقف نہیں ہوں اور میرا امام اُن سے واقف ہے لہٰذا میں اس کی تقلید کر رہا ہوں تو اس سے کہا جائے گا کہ جو مسائلِ شرعیہ تمام ائمہ مجتہدین کے درمیان متفق علیہ ہیں، وہ یقیناً حق ہیں اور ان کے بارے میں تم تقلید کر سکتے ہو، لیکن جن مسائل میں اختلاف ہے، جن میں ایک امام کی رائے کچھ ہے اور دوسرے کی کچھ، ان میں تم کس دلیل کی بنا پر ایک شخص معین کی تقلید کرو گے اور دوسرے کو چھوڑ دو گے درانحالیکہ یہ سب کے سب امام، عالم اور مجتہد ہیں؟ بہت ممکن ہے کہ وہ مجتہد جس کی رائے کو تم ناقابلِ التفات سمجھ رہے ہو تمہارے امام سے زیادہ صحیح مسلک رکھتا ہو۔ اگر وہ یہ جواب دیتا ہے کہ میں اسے حق و صواب پر سمجھ کر تقلید کر رہا ہوں، تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس کے قول کی صحت کا علم تمہیں کتاب و سنت یا اجماع سے ہوا ہے؟ اگر اس نے اثبات میں جواب دیا تو خود اس نے تقلید کا ابطال کر دیا۔ پھر اس صورت میں اس سے ان دلائل کا مطالبہ کیا جائے گا جن کا اس نے ابھی ادّعا کیا ہے۔ اور اگر وہ پھر وہی جواب دے کہ چونکہ وہ مجھ سے بڑا عالم ہے اس لئے میں نے اس کی پیروی کی، تو اس سے

کہا جائے گا کہ اگر یہی تقلید کا سبب ہے تو ہر اس شخص کی تقلید کرو جو تم سے بڑا عالم ہو۔ اس وقت تمہارے بے شمار امام ہو جائیں گے جن کی پیروی مذکورۂ بالا اصول یا علت کی بنا پر تمہارے لئے ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تمام علماء بھی ہمیشہ متفق الرائے نہیں رہ سکتے۔ ان میں اکثر اختلاف رائے ہوتا رہے گا۔ پھر تم ان میں سے کس کے قول کی تقلید کرو گے اور کیوں؟ اب اگر وہ کہے کہ میں ان میں سے ایک کا اتباع اس وجہ سے کروں گا کہ وہ تمام میں سر برآوردہ اور اعلم الناس ہوگا، تو اس سے کہا جائے گا کہ گویا وہ صحابہؓ سے بھی بڑھ کر صاحبِ علم ہے! اور یہ کس قدر مذموم خیال ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہکر دامن چھڑانا چاہے کہ میں تو صحابہ کرامؓ میں سے ایک کی تقلید کرتا ہوں تو پھر سوال ہوگا کہ دیگر صحابہؓ کے اقوال کو ترک کرنے کی وجہ اور دلیل تمہارے پاس کیا ہے؟ ممکن ہے دوسرے صحابہؓ زیادہ علم و معرفت اور عظمت و فضیلت کے مالک ہوں۔ علاوہ ازیں کسی قول کی صحت و سقم کا دار و مدار تو تمام تر دلائل پر ہے۔ قائل کی شخصیت اور شانِ فضیلت پر نہیں ہے۔ چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں کہ آدمی کا ہر قول خواہ وہ کیسا ہی صاحب علم و فضل ہو، اتباع کے لئے نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم مومن کی تعریف یہ کرتا ہے کہ وہ اقوال سُن کر ان میں سے محض حسن قول کی پیروی کرتے ہیں اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ۔

اب اگر وہ اپنے قصورِ علم اور عدم بصیرت کا عذر کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ ہاں ایسی صورت میں تم بلاشبہ کسی عالم کی تقلید کرنے میں نہ صرف معذور رہو بلکہ تم پر اس وقت تقلید کا التزام ضروری ہے، کیونکہ تمہاری مثال بالکل اندھے کی سی ہے جو خود قبلہ کی سمت نہیں معلوم کر سکتا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی قابلِ اعتماد آدمی کی رہنمائی قبول کرے اور جس طرف وہ کہے اسی سمت منہ کرکے نماز پڑھے۔ لیکن ایسے مقلد کے لئے یہ کیسے جائز ہو گیا کہ وہ عالم دین ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسروں کو بھی انہیں اقوال کے مطابق فتویٰ دیتا پھرے؟ درانحالیکہ ان کی صحت و سقم کے متعلق خود اُسے کوئی علم نہیں ہے اور وہ اپنی جہالت کا خود معترف ہے اور کم از کم نظریہ کی حد تک یہ بھی مانتا ہے کہ نبی کے سوا ہر شخص خواہ وہ کیسا ہی فاضل اجل ہو کبھی غلطیاں بھی کرتا ہے۔

دلیل معلوم کئے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں

جب یہ بات طے شدہ ہے کہ عالم غلطی بھی کرتا ہے تو کسی کے لئے جائز نہیں

کہ کسی شخص کے قول کی دلیل کتاب وسنت سے معلوم کئے بغیر اس کے مطابق فتویٰ دے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک خطبے کے دوران میں فرماتے ہیں کہ "افسوس ہے ان حاملین علم پر جن کا علم کسی بصیرت پر مبنی نہیں، جن کے قلوب کو شکوک کا ہلکا سا جھونکا مضطرب کر دیتا ہے، جو نہیں جانتے کہ حق کہاں ہے؟ اگر غلطی کرتے ہیں تو نہیں جانتے کہ غلط کہہ رہے ہیں۔ ایسی چیز کو اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں جس کی حقیقت سے بالکل واقف نہیں۔ یہ ایک فتنہ کی کیفیت ہے۔ سب سے بڑا خیر یہ ہے کہ خدا دین کی معرفت و بصیرت عطا کرے۔ کسی شخص کے جہل کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ اسے اپنے دین کا علم نہ ہو۔"

حضرت سعید ابن جبیرؓ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"اگر کوئی شخص اندھا بن کر بغیر کسی حجت اور بصیرت کے فتویٰ دیتا ہے تو اس فتویٰ پر عمل کرنے والے کا گناہ مفتی کی گردن پر ہوگا۔"

حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

جس شخص نے میرے متعلق ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی تھی، اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنانا چاہئے اور اگر کسی نے اپنے ساتھی سے مشورہ طلب کیا اور اس نے بغیر سوچے سمجھے مشورہ دے دیا تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔ اور اگر کسی مفتی نے اطمینان بخش ثبوت حاصل کئے بغیر فتویٰ دیا تو اس کا گناہ عامل کے بجائے مفتی کے سر پر ہوگا۔"

تقلید صرف عوام کے لئے ہے

لیکن ان تمام تصریحات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حکم عام ہے، اور ہر عالم وجاہل اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ حکم محض علماء اور خواص کے لئے ہے۔ عوام کے لئے نہیں، کیونکہ عوام کے لئے واقعات اور معاملات پیش آنے پر علماء کی تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ان کے لئے تقلید ضروری ہے اس لئے کہ وہ اپنے قصور فہم کی وجہ سے دلائل کی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ بایں سبب اس امر میں تمام علماء کا اجماع ہے کہ عوام پر تقلید فرض ہے۔ اور ارشاد خداوندی فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

کا روئے سخن نہیں عوام کی طرف ہے جس طرح اس بات میں کسی صاحب علم کو اختلاف نہیں ہے کہ اندھے کو قبلہ معلوم کرنے میں کسی غیر آدمی کی جس کی آگاہی اور قوت تمیز پر اسے اعتبار ہو، تقلید ضروری ہے، اسی طرح اس امر میں بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ ایسے شخص کے لئے جو شریعت کے احکام و اسرار سے قطعاً نابلد ہے ضروری ہے کہ کسی امام کی تقلید کرے اور یہی وجہ ہے کہ عوام کو فتوی دینے کا حق کسی نے نہیں دیا ہے کیونکہ وہ اسرارِ دین اور مصالح شرعیہ سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ البتہ غلطی پر وہ لوگ ہیں جو علمِ دین حاصل کرنے کے بعد بھی تقلید کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ علم دین حاصل کرنے کی غرض تحقیق حق ہے نہ کہ محض اگلوں کے اقوال سے واقف ہو جانا۔ جب ایک شخص اس ذریعہ کو حاصل کر لیتا ہے جس سے حق معلوم کیا جا سکتا ہے، اور پھر بھی وہ اس سے کام لے کر حق کی جستجو نہیں کرتا، اور یہ سمجھتا ہے کہ جستجوئے حق اس کا کام ہی نہیں ہے، تو اس کی غلط کاری و غلط فہمی ظاہر و باہر ہے۔

ترجمان القرآن ــــ جیسا کہ علامہ نے مضمون کے آخر میں بصراحت فرما دیا ہے، تقلید کی مخالفت سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ علم کے بغیر اجتہاد کرنے لگیں۔ بلکہ مقصد دراصل یہ ہے کہ اول تو ہر مسلمان کو کم از کم اپنے دین سے اس حد تک ضرور واقف ہونا چاہیے کہ وہ ہدایت اور گمراہی میں تمیز کر سکے اور بالکل آنکھیں بند کر کے اپنا دین دوسروں کے ہاتھ میں نہ دے دے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ دینی علوم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے لیے عقلاً و نقلاً کسی طرح بھی یہ درست نہیں ہے کہ اپنے اوپر تقلید کو لازم کر لیں۔ یہ دراصل ہمارے نظامِ تعلیمی کا بنیادی نقص ہے کہ اس میں طالب علم کو تحقیق کے بجائے تقلید کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ وہ اس نظام میں داخل ہی اس مفروضہ کے ساتھ ہوتا ہے کہ تمام مسائل کا قطعی تصفیہ پہلے ہو چکا ہے، اب تحقیق کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہی، اور اس کا کام فقط یہ ہے کہ اپنے ائمہ کے اقوال سے واقف ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحقیق کے ذرائع فراہم ہو جانے پر بھی وہ مقلد ہی رہتا ہے۔ تحقیق و اجتہاد کا رجحان ابتدا ہی میں فنا کر دیا جاتا ہے اور اس میں آخر وقت تک یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی کہ خود کسی مسئلے میں رائے قائم کر سکے۔ ایسے نظامِ تعلیم سے کس خیر کی توقع کی جا سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے وسائل تو فراہم کر دیے جاتے ہیں مگر دل میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ ان سے تمہیں کام کچھ نہیں لینا ہے۔ اس سے بڑھ کر ناقص تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے۔

دلائل السنن والآثار

۳

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

ضرورت سلسلۂ اسناد یہ ایک واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ احادیث نبوی کے ساتھ اصولی احتیاط خلفائے راشدین کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ تابعین کے دور میں جب رفض، خروج، ارجاء، قدر، اعتزال کے قصے پیدا ہو جاتے ہیں تو بنا بر آیت اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ الخ اور زیادہ تشدد بڑھ جاتا ہے اور اسناد ایک مستقل فن قرار پا جاتا ہے جس کی بیسیوں شاخیں ہیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ **ایک لطیف اشارہ اہمیت اسناد پر** قرآن حکیم میں ہے اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ منکرین معاد و قرآن کے رد میں اوپر سے یہ سلسلہ چلا آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آسمان و زمین اور کل مخلوقات بنائی، کیا سچے دل سے کہا جا سکتا ہے کہ زمین کا کوئی ٹکڑا یا آسمان کا کوئی حصہ کسی اور نے بھی بنایا ہے یا بنا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں پھر خدا کے ساتھ معبودان باطل کو کیوں پکارا جاتا ہے؟ لہٰذا اگر تم اپنے دعوائے شرک میں سچے ہو تو کسی آسمانی کتاب کی سند لاؤ یا کسی ایسے علمی اصول سے ثابت کرو جو عقلاء کے نزدیک مسلم چلا آتا ہو جس چیز پر کوئی نقلی یا عقلی دلیل نہ ہو آخر اسے کیوں تسلیم کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ کسی علمی دعوے کے لئے دلیل و سند ہی اصل شے ہے۔ دیکھو قرآن کی صداقت پر جہاں اور بہت سی دلیلیں موجود ہیں ان میں سب سے زبردست سند اس کا تاریخی ثبوت ہے جتنی مذہبی کتابیں دنیا کی مختلف قوموں کے پاس ہیں ان میں سے ایک کے متعلق بھی تاریخی سند سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جس نبی کی طرف منسوب ہے واقعی اسی نبی کی ہے۔ بلکہ بعض مذہبی

کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق سرے سے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس زمانے میں کس نبی پر اتری تھیں۔ مگر قرآن کے متعلق اتنی زبردست تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ کوئی شخص حضرت محمد صلعم کی طرف اس کی نسبت میں شک کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی آیتوں تک کے متعلق یہ معلوم ہے کہ کونسی آیت کب اور کہاں نازل ہوئی، جس کے روایت کرنے والوں کی اتنی زیادہ تعداد ہر زمانہ میں رہی ہے کہ جن کی صداقت و قطعیت پر ذرہ برابر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایک آیت اور اس کے تلفظ کی کیفیت کو ابتدائے نزول سے آج تک اتنے بیان کرنے والے ہیں کہ جن کی تاریخی حیثیت آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ چنانچہ یہی تواتر عملی و قولی ایسا تاریخی ثبوت اور کھلی ہوئی سند ہے کہ جس سے بڑھ کر کسی علمی شے کی ثبوت اور قطعیت کی کوئی دلیل و سند نہیں ہو سکتی۔ پس آیتِ بالا پر غور کرنے سے صاف طور پر یہ اصول ہاتھ آتا ہے کہ جس کسی مذہبی دعویٰ کے لئے یا تو آسمانی کتاب کی سند ہو یا کسی علمی اصول سے ثابت ہو وہ قرآن کے نزدیک حجت و سند دینی ہے۔

یہ تو ہوئی نقلی دلیل۔ اور عقلی دلیل یہ ہے کہ جب کسی بات کی نسبت کسی کی طرف کی جاتی ہے، تو سب سے پہلے یہ سوال عقلی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اس پر کیا ثبوت ہے کہ یہ فلاں کا کلام ہے؟ آدمی کہتا ہے کہ میں نے خود سنا ہے یا دیکھا ہے یا فلاں نے مجھ سے بیان کیا ہے یا دیکھا ہے۔ اگر یہ سلسلہ اس آدمی تک متصل ہے تو بات صاف ہے۔ اب صرف بات کی معقولیت اور ناقل کی صداقت کی بحث باقی رہ جاتی ہے، جس پر مفصل بحث آگے آئے گی۔ بہرحال اسی اصول کے ماتحت آسمانی کتابیں، سنن و آثار نبوی، لغت و اشعار، فقہ و اصول حتیٰ کہ ائمہ کے مذاہب اور تصوف کے سلاسل سنداً روایت ہونا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ اتنا زبردست اور محکم ثابت ہوا کہ جس کی معقولیت اور ناقابلِ انکار مقبولیت نے مخالفین کی زبانوں پر مہر سکوت لگا دی۔ غور کرو کہ پیغمبر نے ایک بات کہی یا کوئی کام کیا۔ اگر وہ بات اور فعل اس طریقہ پر روایت ہوا اور ذرہ برابر اس کے اندر تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ حق و صداقت اور روحانیت کے اثر اور اس کے برکات ہیں۔ پھر کیا کسی کو کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر علم اپنے اندر ایک خاص کیفیت و اثر رکھتا ہے، جس کی مزاولت و ممارست سے آدمی نیک و بد اور بات کے صحیح و غلط کا فیصلہ کرتا ہے۔

فن حدیث میں سند ایسا علم ہے کہ صرف اسی کے ذریعہ ہر دینی کام کی نسبت پیغمبر صلعم تک صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے اور اس وجہ سے گویا آدمی کے اندر معنیٰ صحابیت کا شرف پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معنیٰ صحابیت نام ہے اطلاع بر جزئیات احوال رسول و مشاہدہ اوضاع و کیفیات کا، خواہ وہ عبادات سے متعلق ہوں یا عادات سے، جو بغیر سند قابل اعتبار نہیں۔ سند کے عالی اور نازل ہونے کے صدہا واقعات کتب رجال و طبقات میں موجود ہیں جو غیر معمولی احتیاط پر دلالت کرتے ہیں۔ صرف ایک واقعہ یہاں پر درج کر دیا جاتا ہے جس سے سند کے عالی و غیر عالی ہونے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ نیشاپور تشریف لے گئے تو حافظ حدیث امام ابو زرعہ رضؓ و امام ابو مسلم طوسی رحؒ نے خدمت میں حاضر ہو کر امام ممدوح کے آباؤ اجداد کرام کے سلسلہ سے روایت حدیث کی درخواست کی۔ حضرت ممدوح نے اپنے والد ماجد سے لے کر جناب رسول خدا صلعم تک مرفوعاً روایت کی "قال حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیہ جعفر الصادق عن ابیہ محمد الباقر عن ابیہ علی زین العابدین عن ابیہ شہید کربلا عن ابیہ علی المرتضیٰ قال حدثنی حبیبی و قرۃ عینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال حدثنی جبرئیل علیہ السلام قال حدثنی رب العزۃ سبحانہ و تعالیٰ کلمۃ لا الہ الا اللہ حصنی فمن قالھا دخل حصنی ومن دخل حصنی امن من عذابی"۔ جب شمار اہل محابر و دواوین کا کیا گیا تو ۲۰ ہزار اشخاص وہاں حاضر پائے گئے۔ چنانچہ اسی سند کے متعلق امام الجرح والتعدیل حضرت امام احمد بن حنبل رحؒ فرماتے ہیں "لو قری ھذا الاسناد علی مجنون لافاق من جنونہ" حتیٰ کہ امام ابو القاسم قشیری رحؒ نے لکھا ہے "اتصل ھذا الحدیث بھذا السند ببعض امراء السامانیۃ فکتبہ بالذھب واوصی ان یدفن معہ فی قبرہ فرأی فی المنام بعد موتہ فقیل لہ ما فعل اللہ بک فقال غفرلی بتلفظی لا الہ الا اللہ وتصدیقی ان محمدا رسول اللہ، اوردہ المنادی فی شرحہ الکبیر علی الجامع الصغیر (تفصار حیوۃ الاحرار)

چنانچہ اسی بنا پر امام ابن سیرینؒ جو فن حدیث کے رکن اعظم ہیں ان کو کہنا پڑا، ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم۔ قال لم یکونوا یسألون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالکم۔ الاسناد من الدین۔ لولا الاسناد لقال من شاء ما قال۔ الاسناد سلاح المومن! امام زہری بڑے رتبہ کے آدمی ہیں ایک روز سفیان بن عینیہ سے ایک حدیث بیان کرنی چاہی سفیانؒ نے فرمایا کہ آپ مجھ سے بلا سند بیان کیجئے کیونکہ ان کو امام زہری پر کامل اعتماد تھا۔ امام زہری نے فرمایا کیا تو بلا زینہ چھت پر چڑھ سکتا ہے؟ ۔[1]

اور یہ واقعہ تو موطا امام مالکؒ کے پڑھنے والے تک کو یاد ہوگا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو تبع تابعی اور خلفاء بنی امیہ میں بڑے رتبہ کے بزرگ ہیں جن کا شمار خلفاء راشدین کے ساتھ ہوتا ہے، ایک روز نماز عصر میں دیر کردی۔ عروہ بن مسعود تابعی نے ٹوکا اور رسول اللہ صلعم کا جبرئیل کے ساتھ نماز پڑھنا اور جبرئیل کا ابتدائی و انتہائی اوقات نماز بتانا بیان کیا۔ خلیفۂ وقت کو سخت تعجب ہوا۔ استعجاباً پوچھا، اعلم ما تقول یا عروہ۔ دیکھو کیا کہہ رہے ہو۔ عروہ نے فوراً اس طرح سند پڑھ کر خلیفہ کو ساکت کر دیا کہ مغیرہ بن شعبہؓ نے کوفہ میں ایک روز نماز میں دیر کردی تو ابو مسعود انصاریؓ نے ٹوک دیا اور کہا کہ مغیرہ یہ کیا ہے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ جبرئیل نے دو روز آکر آنحضرت صلعم کو نماز پڑھ کر نماز کی ابتدا و انتہا کو بیان کر دیا۔ بہر کیف یہ شہادتیں، اس امر کی دلیل ہیں کہ اسناد ہی ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جس کے ذریعہ صحیح و غلط اور روایت و خبر کے پرکھنے اور جانچنے کا اصول ہاتھ آتا ہے، انھیں اسنادیں میں سے بعض کو محدثین و فقہاء نے سلسلۃ الذہب سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً حضرت امام اعظمؒ کا جو سلسلۃ الذہب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے، ابو حنیفہ عن حماد بن ابی سلیمان عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ بن مسعودؓ۔ اسی طرح حضرت امام بخاری کے کئی سلسلے ہیں مثلاً محمد بن اسمٰعیل عن محمد بن عبداللہ الانصاری عن حمید عن انس بن مالکؓ۔ یہی امام بخاری کے بعض شیوخ حضرت امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ کے ہم طبقہ ہیں۔ اور ثلاثیات بخاری، بخاری شریف کی ایک اہم اور محیر العقول چیز ہے۔ امام مالکؒ

[1] تدریب الراوی

کا سلسلۃ الذہب بقول امام بخاریؒ یہ ہے: مالک عن نافع عن عبد اللہ بن عمر۔ اسی قسم کی سندوں کے متعلق محدثین یہ الفاظ بھی بولتے ہیں، فھم اشھر من نار علی علم۔ تفصیل کے لئے فنی اعتبار سے معرفۃ علوم الحدیث للحاکم از صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۸ مطبوعہ مصر ملاحظہ ہو، ثبوت بالا مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر درج کردئے گئے ہیں ورنہ ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ہر فن میں فن والے کی رائے اور اس کی تحقیق و تشریح ہی حجت و سند ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ سنن و آثار نبوی کے معلوم کرنے کے لئے سند کو اصل الاصول نہ قرار دیا جائے درانحالیکہ کوئی اور ذریعہ اس کے مستحکم اور محتاط اذعان و یقین کا موجود نہ ہو۔ بلاریب عمل بھی ایک اہم، مستحکم اور محتاط ذریعہ ہے لیکن یہاں بھی یہ بحثیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ کس کا عمل؟ ایا فرق باطلہ کا یا اہل حق و ارباب نقل کا؟ کیونکہ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کا ثبوت صدر اول میں نہ تھا اور نہ کتاب و سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مگر جماعتی عصبیت جاہلیت کا یہ عالم ہے کہ اسے بھی کتاب و سنت ہی سے ثابت کیا جاتا ہے اور مزید ثبوت کے لئے سواد اعظم اور عملی تواتر کا نام لیا جاتا ہے کہ برابر اہل علم اس پر عمل کرتے آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل بھی وہی صحیح اور حق ہو گا جس کا سلسلہ صحابہؓ اور آنحضرت صلعم تک ثابت ہو اور یہ چیز بھی بدون سند صحیح قابل پذیرائی نہیں ہو سکتی۔ لہذا یہ مختصر گذارش ایک منصف اور محقق کے لئے بس ہے، تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔

عدالت و ثقاہت صحابہؓ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن حکیم خدا کا آخری پیغام ہے جو تمام عالم کی رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ یہ مقدس اور برگزیدہ صحیفہ یزدانی حضرات صحابہؓ ہی کے ذریعہ سارے عالم میں پہنچا اگر ان حضرات کی عدالت اور ثقاہت وغیرہ مشتبہ ہی تو پھر دین و مذہب کی ساری اساس و بنیاد معرض بحث میں آجاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم ہی نے سب سے پہلے صحابہ کے فضائل و اخلاق اور عدالت و ثقاہت کو مفصل بیان فرمایا ہے اور جو لوگ قرآن سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی آیات پر کامل تدبر و تفکر کرنے کے عادی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت (کہ صحابہ عادل اور ثقہ تھے) آفتاب سے زیادہ واضح ہے۔ استیعاب لابن عبد البرؒ وغیرہ میں مفصل گفتگو میں

اس پر موجود ہیں۔ اس موقع پر میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ کی ایک تقریر کا خلاصہ اصابہ سے نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لمبی چوڑی تحریر و تقریر سے بے نیاز کر دینے والا ہے اور جو تمام تر قرآن مجید سے ماخوذ ہے فرماتے ہیں :۔

"حضرات اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ صحابہ عدول ہیں۔ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے سوا مبتدعہ کی ایک مختصر سی ٹولی کے خطیب نے کفایہ میں نہایت نفیس بحث اس موضوع پر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی عدالت و ثقاہت تو خود خدا کی تعدیل کے بموجب ہم مانتے ہیں۔ مثلاً كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اور وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ اور لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ الخ۔ اور اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ اور يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ غرض بہت سی آیتوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ صحابہ عادل اور ثقہ ہیں۔ ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعدیل کے بعد اب وہ کسی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اگر خدا اور رسول کی طرف سے یہ کچھ وارد نہ ہوتا جو ہم نے ذکر کیا ہے تب بھی ان کی گراں قدر خدمات، ہجرت، جہاد، اسلام کی مدد، جانی و مالی قربانی، باپ و بیٹے تک سے لڑ جانا، راہ اسلام میں مناصحۃ فی الدین، قوت ایمان اور عزم و ثبات، یہ سب اس پر شاہد عادل ہیں کہ وہ عادل اور تمام امت سے اعلیٰ و افضل ہیں، اور ان معدلین سے بھی جو ان کے بعد ان پر جرح کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہی تمام علماء کا مسلک ہے۔ ابو زرعہ رازی کہتے ہیں کہ جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اور اس پر اپنا ایمان رکھو کہ رسول حق ہے قرآن حق ہے اور جو کچھ وہ لایا برحق ہے۔ بعدہٗ یہ کہ وہ تمام لوگ جو ان پر جرح کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب و سنت کو باطل کرنا چاہتے ہیں، اور بہتر یہ ہے کہ خود ان پر جرح کی جائے وہ سب کے سب زنادقہ ہیں۔"

لفظ عدالت ایک مشترک لفظ ہے جس کے مختلف معنیٰ ہیں لیکن محدثین کے نزدیک عدالت کے معنیٰ اجتناب عن الکذب کے ہوتے ہیں یعنی اس معنیٰ کر کے عادل اس شخص کو کہیں گے جو روایات میں دروغ بیانی نہ کرتا ہو۔ تمام صحابہ کو اسی معنی میں عدول کہا جاتا ہے۔ یہ کسی محدث کا دعویٰ نہیں ہے کہ صحابہ کوئی بات انصاف کے خلاف نہیں کرسکتے یا ان سے کوئی فعل تقویٰ و طہارت کے خلاف صادر نہیں ہوسکتا یا وہ انبیار کی طرح معصوم ہیں، یا وہ تمام گناہوں سے محفوظ ہیں۔ چنانچہ محدثین نے صاف صاف یہ تصریح کردی ہے۔ علامہ سخاوی فتح المغیث میں اور قاضی شوکانی ارشاد الفحول[۱] میں لکھتے ہیں :۔

"ابن انباری کا قول ہے کہ اتہامات کے ثبوت کے بعد یہ مطلب نہیں کہ صحابہ معصوم ہیں اور ان سے گناہوں کا سرزد ہونا محال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی روایتوں کو اسباب عدالت و ثقاہت کی چھان بین کئے بغیر قبول کرلینا چاہئے۔ بجز اس صورت کے جب وہ ایسے امر کا ارتکاب کریں جو روایات میں قادح ہو اور یہ ثابت نہیں ہے۔"

مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ لکھتے ہیں :۔

"اہل سنت کا یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کل کے کل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار بولا گیا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)، نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ صرف عدالت فی روایۃ الحدیث مراد ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں، اور اس عدالت کی حقیقت "روایات میں اجتناب عن الکذب" ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہ کی سیرت کو خوب ٹٹولا، یہاں تک کہ ان لوگوں کی سیرت کا بھی تتبع کیا، جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے، تو ہم کو معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلعم کے متعلق دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے ہیں اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے ہیں[۲]، (ظفر الامانی)۔"

[۱] صفحہ ۶۷ مطبوعہ مصر، [۲] مقدمہ اسوۂ صحابہ،

یہ ایک واضح امر ہے کہ مدارج روایت اور تفقہ واجتہاد کے اعتبار سے صحابہؓ کے مختلف طبقات تھے لیکن فضل و مناقب کے لحاظ سے، خلفاء راشدین، ازواجِ مطہرات، مہاجرین اولین، انصار، اہل عقبہ و اہل بدر، ومشاہد وغیرہ ایک دوسرے سے افضل ہیں۔ مزیت وفضیلت اضافی چیزیں ہیں ورنہ اس اختلاف مراتب کے باوجود مومن صالح ہونے میں تمام صحابہ برابر ہیں، اور سب کے سب اہل جنت ہیں۔ "وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ"۔

کتاب وسنت کی اہم شہادتوں اور ائمہ کرام کی تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ "صحابہ کی عدالت وثقاہت غیر صحیح، قرآن کے خلاف اور محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے" تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ خدایا یہ کیا مصیبت ہے؟ اب تک تو یہی رونا تھا کہ محدثین نے جو کچھ الفاظ جرح وتعدیل رواۃ حدیث کے متعلق وضع اور استعمال کئے وہ محض ظن اور تخمین تھے، اور ان کا فیصلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن صحابۂ کرام جن کی عظمت وبزرگی، جلالتِ شان اور تقدس وغیرہ پر تو خود قرآن ناطق ہے، جب ان حضرات رضی اللہ عنہم کے متعلق بھی فضا خراب کردی جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ ایسا شخص اہل علم سے بہت دور ہے۔ ورنہ اگر تحقیق مدنظر ہوتی تو سب سے پہلے وہ قرآن کی آیات پر تدبر کرتا۔ وہیں سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ کی روشنی اس کے لئے شمع راہ ہوتی۔ اور رضی اللہ عنہم ورضوعنہ کی تعدیل نہ صرف صحابۂ کرام کے متعلق ملتی بلکہ تابعین کے بارے میں بھی سند ثقاہت ہاتھ آتی۔ اور "خَيْرَ أُمَّةٍ" الخ اور "أُمَّةً وَسَطًا" کے اولین مخاطب کا سراغ ملتا۔ لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ ...... وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ" کا طغرائے امتیاز میزان عدل وقسط قرار پاتا۔ قرآن مجید کے عموم کے مطابق تو جملہ صحابہؓ وتابعین، صالح اور مومن قطعی طور پر ثابت ہیں۔ جو لوگ روایتوں سے صرف تاریخیت کے قائل اور حجت دینی کے منکر ہیں ان کو تو بہر حال صحابہؓ وتابعین کی عدالت وثقاہت قرآن ہی سے ماننی پڑے گی صحابۂ کرام کے غیر ثقہ ہونے پر چاہے ہزاروں جرحیں احادیث وسیر سے پیش کی جائیں، مگر اُن سے قرآن کے فیصلہ "رضی اللہ عنہم ورضوعنہ" وغیرہ آیات پر تو ذرہ برابر اثر نہیں پڑسکتا۔ رہ گئے وہ لوگ جو روایتوں یعنی سنن وآثار نبوی کو حجت دینی

مانتے ہیں تو وہ نہ تو صحابہ کو معصوم سمجھتے ہیں نہ خطا ولغزش بشری سے پاک۔ ہاں خواہ مخواہ ان کی نیتوں کے متعلق سوءِ ظنی رکھنا جس پر نہ قرآن راضی نہ اللہ ورسول کا حکم، کسی طرح جائز نہیں رکھتے۔ مشاجراتِ صحابہ محض ایک اجتہادی غلطی تھی ورنہ واقعات شاہد ہیں کہ باوجود شدید اجتہادی اختلاف کے ایک دوسرے کا احترام فرماتے تھے۔ حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ کو ام المومنین کہتے رہے۔ خود حضرت عائشہ جن کی برأت وتطہیر قرآن نے کی اور حضرت علیؓ جن کو آنحضرت صلعم نے بمنزلہ ہارونؑ کے کہا کیونکر غلطی فرما سکتے تھے۔ کیا قرآن اس ہستی کی برأت کر سکتا تھا جو فتنہ میں ملوث ہونے والی ہو؟ کیا پیغمبر ایسے شخص کو بمنزلہ ہارون کہتا جو باطل کے لئے جنگ وجدل کریں؛ نہیں ہرگز نہیں۔ یہی وجہ تو تھی کہ باوجود ان باتوں کے کوئی ایک صحیح واقعہ موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ حضرات ایک دوسرے کو (معاذ اللہ) برا کہتے یا سمجھتے تھے۔

یہ ہے واقعہ کی اصلی تصویر اور صحابہ کی عدالت کی حقیقی تعبیر۔ کیا یہ بات آج کل کے آزاد اور نام نہاد مفسرون کے لئے حیرت انگیز نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جو بحکم قرآن نبی ورسول ہیں، ان سے "لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي" اور "أَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ" کا صدور ہو جائے۔ انتہائی غیظ وغضب میں حضرت ہارون کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑیں اور کھینچنے لگیں۔ یہی کہا جائے گا نا کہ (حاشا) ہارون کی اہانت کی نیت سے ایسا نہیں کیا تھا؟ اور حضرت موسیٰؑ اس حالت میں شرعاً معذور تھے۔ فرط غضب اور ہنگامہ دار وگیر میں الواح ہاتھ سے چھوٹ گئیں جسے عدم تحفظ کی وجہ سے تغلیظاً القاء سے تعبیر فرمایا گیا کیونکہ بظاہر "خُذْهَا بِقُوَّةٍ" کا امتثال نہ کر سکے۔ مگر چونکہ ان دونوں معاملات کی سطح جو ہارون یا الواح کے متعلق ظہور میں آئی بہر حال صورت پسندیدہ نہ تھی گو موسیٰؑ باعتبار نیت معذور تھے، اس لئے "أَنَّهُ رَبِّ اغْفِرْ لِي" کہکر حق تعالیٰ سے عفو کی درخواست کی؛ یا اس کے سوا اور کوئی تاویل ہوگی؟

یہ باتیں ان حضرات کے لئے زیادہ غور کرنے کی ہیں جو محض قرآن کو آڑ بنا کر عصمتِ انبیاء، وعظمت صحابہ کا نام لے کر سنن وآثار نبوی کو مجروح کرنے کے عادی ہیں۔ ایک طرف تو زبانی ادعائے قرآن دانی اور دوسری جانب علوم و فنونِ اسلامیہ سے بیگانگی، ہجر وفقدان کا یہ عالم کہ اگر کوئی روایت ذرا بھی بظاہر معارض نظر آئی جمع وتوفیق کی بیسیوں

شکلوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور فوراً یہ کہنا شروع کر دیا جاتا ہے کہ قرآن کے خلاف ہے عقل کے منافی ہے، آنحضرت صلعم کی عصمت اور صحابہ کرام کی عظمت و رفعت، ازواج مطہرات کی عفت و طہارت کا مقام اس سے بلند ہے۔ سننے والا مرعوب ہو جاتا ہے اور یارانِ طریقت اپنا کام کر جاتے ہیں۔ حالانکہ سیدھی سی منطق ہے کہ اگر قول و فعل پیغمبر صلعم کا ہے تو وہ قیامت تک بیان بالا کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ صحیح عقل و نقل میں کبھی تعارض نہیں رہا ہے۔

یہ حال ہے ان بخاری وقت لوگوں کا۔ یہ حضرات تو پیغمبر اور صحابہ وغیرہ کی عظمت و عصمت کو سمجھیں اور نہ سمجھیں تو امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، علی بن المدینیؒ، یحیی بن سعید القطانؒ، ابو حاتم رازیؒ، ابو زرعہؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، یحیی بن معینؒ، علامہ ابن حزمؒ، ابن قیمؒ و شاہ ولی اللہ وغیرہم ایک ایسی جماعت ہو جو اسلام کے لئے سخت مضر اور سم قاتل ہے۔ اس کے دام تزویر میں اکثر بڑے بڑے عباد و زہاد اور مغرب زدہ سعادت ازلی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسی بے اصول جماعت سے گفتگو ہو بھی تو کیوں کر؟

بحث و مناظرہ سے بجائے اس کے کہ حق کو حق سمجھا جائے زیادہ تر معاملہ برعکس ہی ہوتا ہے، ورنہ قرآنِ کریم تو بآواز بلند مدعی ہے کہ اصحاب محمد رسول اللہ صلعم کی قدوسیت توریت و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہے ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

"وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا، .... اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں،، (استثنا، باب ۳۳ صفحہ ۲۰۱)

کیا مذکورہ پیشینگوئی فتح مکہ کے دن پوری نہیں ہوئی؟ قرآن کو پڑھو تو اس میں اصحاب رسول اللہ کے ایک ایک خدوخال کو واضح کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ آخر اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ کیا اس زبردست شہادت کے بعد بھی کسی کو صحابہ کی عدالت و ثقاہت میں شبہ رہتا ہے؟ کون مسلمان ہے جو پنجوقتہ نمازوں میں سورہ فاتحہ نہ پڑھتا ہوگا مگر کیا کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا گیا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے

کن کے راستے کی طلب مراد ہے اور وہ کون لوگ ہیں جن پر انعام و اکرام باری کی بارش ہوئی اور منعم علیہم قرار پائے؟ اس کا جواب قرآن خود دیتا ہے "مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ" کیا صالح ہونے میں خلفاء راشدین کے علاوہ صحابہ کی جماعت داخل نہیں ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی اجتہادی غلطیوں کو نفاق و شقاق، (معاذاللہ) عدوان اور سرکشی سے تعبیر کر کے اپنے نامۂ اعمال کو خراب کیا جاتا ہے "کل مجتہد مصیب والمصیب واحد والمخطی معذور بل ماجور" کی توجیہ ایک منصفانہ اور عالمانہ فیصلہ ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی حق پسندانہ بات فرمائی ہے کہ "تلک دماء طھر اللہ منھا سیوفنا فلا نخضب بھا السنتنا"[1] تلاش حق و صداقت اور غور و فکر کے لئے اتنے اشارات کافی ہیں، بشرطیکہ تحقیق مدنظر ہو۔

سنن و آثار نبوی کے مرکزی مقامات اور ان کی نشر و اشاعت

مذکورہ مباحث کے بعد یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد مختلف مقامات پر اپنے مراکز اور چھاؤنیاں قائم کر لی تھیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ خدا کی راہ میں جہاد وغیرہ کے لئے نکلے۔ لوگ ان کے پاس جمع ہوتے۔ وہ ان کے سامنے خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کو ظاہر فرماتے اور کسی چیز کو کبھی نہ چھپاتے۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، شام، بصرہ، یمن، جزیرہ، خراسان، مصر میں صحابہ کی جماعت موجود تھی لیکن سیاسی اور مذہبی اعتبار سے اول الذکر ہر سہ مقامات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

صحابہ میں حضرات خلفاء اربعہ اور ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، عمار بن یاسرؓ، حذیفہؓ، سلمانؓ، ابو درداؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ فقہائے صحابہ کے نام سے موسوم ہیں اور اکثر آنحضرت صلعم کے عہد میں فتویٰ دینے کے مجاز تھے۔ ان کے علاوہ مفتیانِ صحابہ کی تعداد ۱۲۰ سے متجاوز ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ، انس بن مالکؓ، جابر بن عبداللہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، عائشہؓ، علامہ ابن جوزی کی

---

[1] ارشاد الفحول

اصطلاح میں رواۃ صحابہ ہیں۔[1]

سنن و آثار نبوی سے جو احکامات ثابت ہیں بقول علامہ خطلی صرف حضرت ابو ہریرہ سے ڈھائی ہزار مروی ہیں۔[2] اور جنھوں نے سنن ابی داؤد و جامع ترمذی، الامام ابن دقیق العید منتقی الاخبار لابن تیمیہؒ وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ احکامات اسلامی کی فہرست کس درجہ طویل اور معاشرتی و تمدنی زندگی کو حاوی ہے لیکن بقول علی بن المدینی جس کو ابو بکر خطیب نے روایت کیا ہے تین شخص ایسے ہیں جن پر احکامات نبوی صلعم کا علم منتہی ہوتا ہے، وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلبؓ۔ آپ ہجرت کے دو سال پہلے پیدا ہوئے اور رسول اللہ صلعم نے آپ کے لئے دعا کی کہ "خدا ان کو دین میں فقیہ بنا اور ان کو تاویل کتاب الہٰی سکھا" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ابن عباس قرآن کے کس قدر اچھے ترجمان ہیں۔ اگر ان کو ہمارا سن و سال ملتا تو ہم میں کوئی ان کا ہمسر نہ ہوتا۔ معمرؒ کا قول ہے کہ ابن عباس کا عام علم تین بزرگوں سے ماخوذ ہے۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت ابی بن کعبؓ۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ خود حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ میں جب یہ سنتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس حدیث ہے تو اس کے ہاں جاتا تھا اور اس کے انتظار میں بیٹھ جاتا تھا یہاں تک کہ جب وہ نکلتا تو میں اس سے پوچھ لیتا۔" تفسیر اور فقہ میں اہل مکہ کے علم کا دار و مدار حضرت ابن عباس ہی پر ہے۔ آپ نے ۶۸ھ میں بمقام طائف وفات پائی۔[3] آپ کے ممتاز تلامذہ میں سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، مجاہد، جابر بن زید، طاؤسؒ وغیرہ ہیں۔ ان تمام کے علم کا سلسلہ عمرو بن دینار پر منتہی ہو کر روئے زمین پر چھا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاووں کو مامون عباسی کے پوتے نے جمع کرایا تو ۲۰ کتابیں ہوئیں۔[4]

(۲) حضرت زید بن ثابت کاتب الوحیؓ۔ آپ کے والد کا نام ضحاک تھا اور انصار کے قبیلہ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلعم جب مدینہ آئے تو آپ کی عمر ۱۱ سال کی تھی۔ سب سے پہلے آپ نے غزوۂ خندق میں شرکت کی۔

---

[1] تلقیح فہوم الاثر [2] فصول الحواشی [3] تاریخ فقہ اسلامی [4] المدخل لابن بدران

تبوک کی جنگ میں بنو مالک بن النجار کا جھنڈا حضرت عمارہ بن حزم کے ہاتھ میں تھا لیکن رسول اللہ صلعم نے ان سے لے کر حضرت زید بن ثابت کے حوالہ کر دیا۔ عمارہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میرے متعلق آپ کو کوئی بات معلوم ہوئی ہے؟ فرمایا "نہیں لیکن قرآن مقدم ہے اور زید نے تم سے زیادہ قرآن پڑھا ہے"۔ حضرت زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں کاتب کی خدمت انجام دیتے تھے۔ حضور کے پاس سریانی زبان میں بہت سے خطوط آتے تھے۔ اس لئے حضرت زید بن ثابت نے آپ کے ارشاد سے سریانی زبان سیکھی۔ آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بھی کاتب رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو تین بار مدینہ میں اپنا جانشین بنایا۔ حضرت عثمانؓ بھی جب حج کو جاتے تھے تو آپ کو اپنا جانشین کر جاتے تھے۔ آپ صحابہ میں سب سے زیادہ فرائض کے عالم تھے چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ زید تم میں سب سے زیادہ علم فرائض کو جانتے تھے۔ آپ صحابہ میں بہت بڑے عالم اور راسخین فی العلم میں تھے۔

آپ جمع و ترتیب قرآن کے رکن اعظم ہیں۔ آپ کا عمل یہ تھا کہ صرف اپنی یاد اور اپنے لکھے ہوئے اجزا ہی پر قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ اور حفاظ کی یاد اور دوسرے کاتبوں کے صحیفوں اور ان اجزاء سے بھی آپ نے مدد لی جو رسول صلعم کے گھر میں لکھے ہوئے موجود تھے۔ آپ نے مہاجرین اور انصار کے اتفاق سے اس مجموعہ کو مکمل کیا اور حضرت شیخینؓ کے ذریعہ خدا نے اپنی اس ضمانت "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ" کو پورا فرمایا۔ حضرت عثمانؓ نے جب اپنے زمانہ میں اس کام کے لئے لوگوں کو تعین فرمایا تو حضرت زید بھی بحیثیت رکن اعظم شریک تھے۔ بہت سے صحابہ اور تابعین نے آپ سے روایتِ حدیث کی مثلاً فقہاء سبعہ مدینہ منورہ، قبیصہ بن ذویب، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، سالم بن عبداللہ، ابان بن عثمان وغیرہ۔ ان تمام لوگوں کا علم تین حضرات پر منتہی ہوتا ہے، ابن شہابؒ، ابوبکر بن عبداللہ الاشج اور ابوالزنادؒ۔ پھر ان تمام کا علم حضرت امام مالکؒ تک پہنچ کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل پڑتا ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہذلی۔ بنو زہرہ کے حلیف اور قدیم الاسلام ہیں۔ آپ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے آپ کو چھ مسلمانوں میں کا چھٹا مسلمان پایا۔ اس وقت سطح زمین پر ہم لوگوں کے سوا کوئی اور مسلمان نہ تھا۔

مکہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے باعلان قرآن مجید پڑھا۔ جب آپ اسلام لائے تو رسول اللہ صلعم نے آپ کو اپنی خدمت میں رکھ لیا۔ آپ خدمت کرنے لگے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم کو اندر آنے کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں، تمہاری اجازت صرف یہ ہے کہ تم میری بات سن لو اور پردہ اٹھا ہوا ہو۔ چنانچہ وہ آپ کے پاس اندر آتے جاتے، آپ کو جوتا پہناتے، آپ کے ساتھ آگے آگے چلتے، جب آپ غسل فرماتے تو پردہ کرتے، اور جب آپ سوتے تو آپ کو بیدار کرتے۔ حبشہ اور مدینہ دونوں جگہ ہجرت کی اور دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ رسول اللہ کے ساتھ بدر، احد، اور خندق، بیعۃ الرضوان اور تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور آپ کے بعد معرکۂ یرموک میں شرکت کی۔ آپ سے بہت سے صحابہ اور تابعین نے حدیث کی روایت کی ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے کہا گیا کہ ہم کو ایسا شخص بتائیے جو طور و طریقے میں آنحضرت صلعم سے سب سے زیادہ قریب ہو تاکہ ہم اس سے حدیث سنیں اور اخذ کریں۔ بولے طرز و روش میں آنحضرت صلعم سے سب سے زیادہ قریب ابن مسعود ہیں۔ اصحابِ محمدؐ میں جو لوگ محفوظ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ابن ام عبد، سب سے زیادہ مقرب بارگاہِ الٰہی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ خلیفہ بناتا تو ابن ام عبد کو بناتا۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو کوفہ بھیجا اور باشندگانِ کوفہ کو لکھا کہ "میں نے عمار بن یاسر کو امیر اور عبداللہ بن مسعود کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دونوں رسول اللہ صلعم کے شریف ترین بدری صحابی ہیں۔ ان کی پیروی اور اطاعت کرو اور ان کا کہنا مانو۔ میں نے عبداللہ بن مسعود کو بھیج کر تمہارے ساتھ ایثار سے کام لیا ہے۔" آپ اہل کوفہ کے معلم اور قاضی کی حیثیت سے وہاں مقیم رہے اور وہاں کے باشندوں نے آپ سے اخذ حدیث کیا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے قرآن پڑھا۔ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھا۔ مذہب کے فقیہ اور حدیث کے عالم تھے۔ حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ سے باقاعدہ علم شریعت حاصل کیا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں ۳۲ھ میں آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی۔[1]

اس موقع پر یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے علقمہ، اسود، عبیدہ، حارث بن قیس، مسروق،

[1] تاریخ فقہ اسلامی و کوکب الدری

عمرو بن شرحبیل وغیرہ نے علوم حاصل کئے اور ان حضرات سے ابراہیم نخعی اور شعبی نے اور ان سے امام ابو حنیفہ، ابو اسحٰق اور اعمش نے اور ان سے حضرت سفیان ثوری وغیرہ نے۔ علمائے کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علیؓ کے تلامذہ کی فہرست بہت ہی طویل ہے (تفصیل کے لئے "معرفۃ علوم الحدیث" للحاکم وغیرہ ملاحظہ ہو) ان سے صدہا بلکہ ہزارہا مخلوق الٰہی نے سنن و آثار نبوی کی تعلیم حاصل کی اور اسی علم کے ذریعہ سے معاملات مذہبی و سیاسی کو انجام دیا اور پھر یہ علوم دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق پرچے

ترجمان القرآن کے مندرجہ ذیل سابق پرچوں کی دفتر ہذا کو ضرورت ہے۔ جو حضرات ان پرچوں کو قیمتاً فروخت کرنا چاہتے ہوں۔ یا جنکے پاس یہ پرچے زائد موجود ہوں وہ براہِ کرم ان پرچوں کو بذریعہ ڈاک ہمارے پاس روانہ کردیں۔ اور لفافہ پر اپنا مکمل پتہ تحریر فرما دیں تاکہ ۸ر فی پرچہ کے حساب سے ان کو قیمت روانہ کی جاسکے۔

رسائل و اخبارات کے اڈیٹر صاحبان سے بھی گزارش ہے کہ اگر وہ مکمل فائل نہ رکھنا چاہتے ہوں۔ اور ان کے پاس یہ پرچے ہوں تو وہ بھی ان پرچوں کو بھجوا کر قیمت وصول کرلیں۔

سال ۵۲ھ	جلد ۲	عدد ۱	ماہِ محرم	سال ۵۶ھ	جلد ۱۰	عدد ۳	ماہِ ربیع الاوّل
"	جلد ۳	عدد ۲	ماہِ شعبان	"	"	عدد ۴	ماہِ ربیع الثانی
"	جلد ۳	عدد ۳	ماہِ رمضان	"	جلد ۱۱	عدد ۲	ماہِ شعبان
سال ۵۴ھ	جلد ۶	عدد ۱	ماہِ محرم	"	"	عدد ۳	ماہِ رمضان
"	"	عدد ۲	ماہِ صفر	سال ۵۷ھ	جلد ۱۲	عدد ۵	ماہِ جمادی الاولیٰ
"	"	عدد ۳	ماہِ ربیع الاوّل	"	"	عدد ۶	ماہِ جمادی الاخریٰ
"	"	عدد ۴	ماہِ ربیع الثانی	"	جلد ۱۳	"	ماہِ رجب
سال ۵۶ھ	جلد ۱۰	عدد ۲	ماہِ صفر				

منیجر

اسلام اور وطنیت

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

[پچھلے دنوں قومیت اور وطنیت پر جو گرما گرم بحثیں ہو چکی ہیں، ان سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ان لفظی نزاعات سے بالکل صرف نظر کر کے وطن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی محتاج توضیح چیز نہ تھی اور اس عنوان پر قلم اٹھانا خواہ مخواہ ایک ایسے مسئلے کو اہمیت دیدینا ہے جو مسلمان کی نگاہ میں کبھی اہم نہ تھا، مگر زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ اس بے حقیقت چیز کو حقیقت کی حد تک پہنچا دیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان علی الاعلان اسے حقیقت ہی کی حیثیت سے قبول کرتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ اب تو اسلام اور وطن پرستی ایک کر کے رکھ دی گئی ہے]

حب وطن اور وطنی عصبیت نئی چیزیں نہیں ہیں۔ آغاز تمدن سے چلی آ رہی ہیں لیکن عملاً جتنا فروغ اور احترام انھیں نئی تہذیب نے بخشا ہے پرانی دنیا اس کا تصور بھی نہ کر سکی ہوگی۔ اب وقت کی فیاضی نے وطن کو وہ تمام حقوق دے دیے ہیں جو کسی معبود ہستی ہی کے شایان شان ہو سکتے ہیں یعنی وطن ہی وہ چیز ہے جس کی حرمت، خدمت، حمایت اور تقدیس شرف انسانی کی آخری معراج اور نظام حیات کے دائرہ کا مرکزی نقطہ ہے۔ اصول اخلاق، آئین سیاست، ضابطۂ تہذیب اور قانون معیشت و معاشرت مستقل حقایق کے بجائے وقتی مفروضات ہیں جو وطنی مصالح کے اشارہ پر ہر آن ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا میرے وطن کے ساتھ ہے کوئی کہتا ہے میرا وطن خدا کا اپنا وطن ہے۔ اور کوئی یہ کہکر کہ "میرا وطن ہی خدا ہے" آگے بولی بولنے والوں کی زبان ہی بند کر دیتا ہے۔ گویا پہاڑ اور دریا صرف زمین ہی کے خطوں کو الگ نہیں کرتے بلکہ انسانیت کے

مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔ خدائی تک کو تقسیم کر ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حب وطن کی عظمت وکبریائی کا یہ عالم ہے تو اس کی محبت اور عصبیت مقدس ترین جذبہ کیوں نہ ہو؟ اس کی پرستش روشن خیالی کا منتہیٰ کیوں نہ ٹھیرے؟ اس کی راہ میں لڑنے والا غازی اور مجاہد کیوں نہ مانا جائے؟ اور اس کی آن پر سر دینے والا شہید اور زندۂ جاوید کیوں نہ کہا جائے؟۔

مہذب دُنیا نے وطن کے ان حقوق کی حمایت میں اتنا شدید پروپگنڈا کیا کہ مشرق کی "نیم مہذب" اقوام کو ان کی واقعیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اسلامی ممالک کے وہ حصے جو اس سرچشمۂ تہذیب سے نسبتہً زیادہ قریب تھے سب سے پہلے انھوں نے عملاً اس تصور کو قبول کیا اور خدا جانے مغرب کے اس ظاہر فریب اور ہلاکت بداماں تصور کی گرفت سے ان کے ذہن کب آزاد ہوں گے لیکن اب تو اس ذہنی غلامی کا ماتم کرنے کے لیے ہمیں نہ اصفہان جانے کی ضرورت ہے نہ انقرہ، یہ روہمالہ کی دیواروں کو توڑ کر ہندوستان میں بھی داخل ہو چکی ہے اور طوفان کی سی تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے، اور جو ایک آدھ شکستہ اور نیم جان بند ہماری امیدوں کا آخری سہارا تھے کہ وہ اس رو کو روک سکیں گے، وہ بھی راہ سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو علیٰ وجہ البصیرت اسے اسلام کے خلاف سمجھ رہے ہیں لیکن آزادی کے جوش اور سیاستِ حاضرہ کے مصالح نے ان کی زبانیں گنگ کر دی ہیں۔ دوسرا گروہ ذرا ان سے زیادہ "روشن خیال" اور ساتھ ہی "جری" اور "باحمیت" بھی ہے۔ اس سے غیر مسلموں کا یہ طعنہ کہ "مسلمانوں میں وطن کی محبت نہیں وہ بھارت ماتا سے زیادہ عرب کا درد رکھتے ہیں" سہا نہ گیا اور اس نے اس دلخراش طعنہ کے جواب میں ع

کہ حب الوطن ہے نشاں مومنیں کا

کا ترانہ گاتے ہوئے چیلنج کیا کہ جسے وطن پرستی کا دعویٰ ہو سامنے آئے اور بتائے کہ کس کی شریعت "حب الوطن من الایمان" کی تعلیم دیتی ہے؟ پھر اس سراسر مادہ پرستانہ جملہ کو ارشاد نبوی کی حیثیت سے اس قدر مشہور کیا گیا کہ اچھے اچھے ارباب فہم اس دھارے میں بہ گئے۔ اور اگر روایتہً نہیں تو معنیً اسے فطرتاً اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھنے لگے۔

ظاہر ہے کہ جب وطن کی محبت جزو ایمان ہے تو وطن کی راہ میں لڑے اور مرے بغیر (یعنی جہاد کئے) اور سر میں سودائے شہادت رکھے بغیر، ایمان کی تکمیل کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور کسی مسلمان کے خلوصِ ایمان کے ثبوت میں اس کی وطن پرستی سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟

لیکن کیا حبِ وطن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہی ہے؟ سطور ذیل میں ہم اسی سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں، اور قطع نظر اس سے کہ فقیہانِ قوم کیا کہتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور اس کا رسول کیا کہتا ہے۔

حبِ وطن کا وجود ایک بدیہی اور مسلّمہ حقیقت ہے، ایسی بدیہی اور مسلّم کہ اس پر کسی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہر انسان کی طبیعت بجائے خود اس پر گواہ ہے۔ اسے جتنا لگاؤ کافر کی فطرت سے ہے اتنا ہی ایک مومن کی فطرت سے بھی ہے۔ اس کے وجود سے بڑے سے بڑے صاحب ایمان کا دل و دماغ خالی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو اپنے وجود کا اعلان اس قلب اور زبان سے کرایا جسے مہبطِ وحی اور لسانِ وحی کہا جاتا ہے۔ مکہ سے نکلتے وقت ایک طرف چشمِ مبارک سے غم و حسرت کے آنسو بہ رہے تھے، دوسری طرف زبان بے اختیار کہہ رہی تھی کہ "اے مکہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے، پر کیا کروں تیرے ہی فرزند تیری آغوش سے مجھے محروم کر رہے ہیں"۔ اور پھر بلال رضی اللہ عنہ کے وہ نغمات درد تو آج تک ضرب المثل ہیں جو ان کی مضطرب روح کی گہرائیوں سے یادِ وطن میں نکل نکل کر مدینہ کی پہاڑیوں میں گونجا کرتے تھے۔ غرض ایمان یا عدمِ ایمان کوئی شئے بھی اس جذبۂ بشری پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ماں کی، باپ کی، بیٹی کی، بیوی کی، بھائی کی، بہن کی، احباب اور اقارب کی، کسی کی بھی محبت پر ان اعتقادی نزاعات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ تو سب کے سب خالص بشری جذبات ہیں جو بلا لحاظ کفر و ایمان بنی نوع انسان کی سرشت میں صانعِ ازل نے اس وقت سے ودیعت رکھے ہیں جب خود انسان کو ان کے وجود کا احساس بھی نہ تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم خود اس حقیقت کو تسلیم کر کے فطرتِ انسانی کی ساخت کے متعلق فرماتا ہے:-

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوَاتِ مِنَ بنی نوع انسان کو فطرتاً مرغوباتِ دنیوی یعنی بیویں،

النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ الخ (آل عمران۔ رکوع ۲)	بیٹوں، سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں، عمدہ عمدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

وطن کی محبت بھی اس "حُبُّ الشَّھَوٰتِ" کے دائرے سے خارج نہیں۔ حُبِّ شہوات سے مراد ہے مادیات کی محبت۔ وطن کی محبت بھی دیگر تعلقات دنیوی کی طرح ایک مادّی اور دنیوی تعلق کا نام ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو انھیں تمام اشیاء کی محبت ہی حب الوطن کی محرک اور علت بلکہ عین حبِّ وطن ہے۔ انسان جس ماحول اور سوسائٹی میں، جن احباب اور متعلقین کے درمیان اور جن لوازم زندگی کے ساتھ رہتا سہتا ہے، ان سے اسے ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے، اسی انس کا دوسرا نام حُبِّ وطن ہے۔ اس انس کے وجود کو قرآن تمام نوعِ انسانی یعنی "النَّاس" کی جبلت میں مرکوز بتاتا ہے۔ اس "النَّاس" کے فرد جس طرح ابوجہل اور ابولہب ہیں اسی طرح صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی۔ کسی کی خلقت "زُيِّنَ لِلنَّاسِ" کے حکم عام سے باہر نہیں ہے۔ پھر ان عام جذباتِ انسانی کو کفر و ایمان کے جھگڑوں سے کیا تعلق ؟۔

مادّی تعلقات کے متعلق اسلام کا نظریہ سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حبِّ وطن کے مخصوص تعلق کے بجائے عام تعلقاتِ دنیویہ کے بارے میں ہم اسلام کا نقطۂ نظر سمجھ لیں۔ کیونکہ زیر بحث مسئلہ بھی اسی ضمن میں خود بخود حل ہو جائیگا اور یوں بھی قرآن جب کبھی ان دنیوی تعلقات اور مادّیات سے متعلق جذباتِ انسانی کے بارے میں کچھ فرماتا ہے تو زیادہ تر ان کی مجموعی حیثیت کو ہی سامنے رکھ کر فرماتا ہے۔ کسی تعلق کی جداگانہ حیثیت اس کے دائرۂ بحث میں بہت کم آتی ہے۔

یقیناً جہاں تک ان جذبات کے نفس وجود کا تعلق ہے، وہ دیر و حرم کے جھگڑوں سے بے نیاز ہیں۔ وہ اپنا یہ حق ہر شیخ و برہمن سے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ محل نزاع یہ نہیں ہے کہ یہ جذبات آدمی میں ہونے چاہئیں یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کی جائز حد کیا ہے، اور انسان کے نفس پر ان کے حقوق کس قدر ہیں۔

اسی سوال پر پہنچ کر اسلام اور جاہلیت کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسلام ہر مادی تعلق کو چند حدود سے مقید کرتا ہے اور جاہلیت انھیں توڑنے پر اصرار کرتی ہے۔ (حبِ وطن کے بارے میں بھی دونوں کے تصورات بالکل ایسے ہی جداگانہ واقع ہوئے ہیں۔ جاہلیت وطن ہی کو دین وملت بلکہ خدا بھی سمجھ لے تو بعید نہیں، مگر اسلام وطن کی محبت کو نہ اتنی تقدیس کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ اسے اتنے غیر محدود حقوق دیتا ہے)۔ اسلام دنیا کی تمام مرغوبات سے حظ اٹھانے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن اپنے نظام اور اصولِ کار میں کسی مادی شئے کے اثر اور اقتدار کو قبول نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر وہ دنیا کو برتنے تو دیتا ہے، لیکن پوجنے نہیں دے سکتا۔ اس کے دستور العمل (قرآن) کے قریباً ہر صفحہ میں یہ وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا کے آخری الفاظ ہی میں ارشاد ہوتا ہے ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یعنی یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں جن کی طرف میلان انسان کی فطرت میں داخل ہے، "متاع قلیل" ہیں۔ ان سے تمتع تو ضرور کرو، لیکن انھیں کو مقصود بالذات سمجھ کر ان کی پرستش میں نہ لگ جاؤ، تمھاری منزلِ مقصود اس سے بلند تر ہے۔ ان حیاتِ دنیوی کی زینتوں پر اگر تم فریفتہ ہو گئے اور انھیں کے ہاتھوں میں اپنے نظامِ حیات کی باگیں دے دیں تو یقین کرو تم مقصدِ حیات کی تکمیل میں ناکام اور زندگی کی آزمائش گاہ میں فیل ہو گئے۔ کیونکہ ہم نے تمھیں اس واسطے نہیں پیدا کیا کہ دنیوی علائق کی سرمستیوں میں غرق ہو جاؤ، بلکہ اس آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے کہ ان بندشوں کے اندر بھی کون اپنی عقل اور روح کو آزاد اور زندہ رکھتا ہے اور ان میں گرفتار ہونے کے بجائے ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ وہ اللہ جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

اور یہ آزمائش اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس امتحان گاہ (دنیا) کے اندر بنی آدم کے لیے مزلاتِ اقدام نہ پیدا کیے جاتے۔ چنانچہ وہ پیدا کیے گئے اور اس کثرت اور قوت کے ساتھ کہ آدمی میں اگر حقیقی

بینائی ہو تو اپنی کمزوریوں کے مقابلہ میں ان کی بے پناہی اور آفاق گیری کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔ وہ مزلات کیا ہیں؟ یہی مرغوباتِ نفس جن کی طرف آیتِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، اور جن کا ایک جامع نام کتاب اللہ نے "متاعِ حیاتِ دنیا" رکھا ہے۔ یہی متاعِ دنیا انسان ظلوم وجہول کے لیے مزلّہ اقدام ہے۔ یہ نہ ہوتی تو یہ عالمِ عنصری، دار ابتلا بھی نہ بنتا۔ اسی لیے انسان کو بار بار چوکنا رہنے کی تاکید کرتا ہے:۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (لقمان۔ ۴)

پس تمھیں یہ دنیوی زندگی (اصل مقصد وانجام) کی طرف سے دھوکہ میں نہ ڈال دے اور نہ خدا کے بارے میں فریب کار شیطان تمھیں دھوکہ دے پائے۔

اور پھر یہی وہ خطرناک پہلوانِ زخارفِ ارضی کا ہے جس کی وجہ سے انھیں قرآن میں جگہ جگہ "فتنہ" کہا گیا ہے، اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (تغابن۔ ۲) وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (انفال۔ ۳) "فتنہ" قرآنی اصطلاح میں ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں خیر وشر دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان کے حدود پہچان کر ان کا صحیح استعمال اور استفادہ کرے تو وہ اس کے لیے سراپا خیر ثابت ہوتی ہیں لیکن اگر اس نے اس امتیاز اور استعمال میں غلطی کی تو یہی چیزیں اس کے حق میں شر بن جاتی ہیں، اور انسان اپنی آزمائش میں ناکام ہو کر معتوبِ الٰہی قرار پاتا ہے، اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں اس کے لیے دشمن ثابت ہوتی ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے انھیں انسان کا عدو بھی کہا گیا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (تغابن۔ ۲) یعنی اے ایمان والو تمھاری بیویوں اور بچوں ہی میں سے تمھارے دشمن ہیں، پس ان کی محبت کے فتنوں سے بچتے رہو۔ کیونکہ انسان کے راہ قسط وعدل سے ہٹنے کا سب سے بڑا واحد سبب یہی عشقِ مال اور حبِ عیال ہی تو ہے جو انسان کو ادائے فرض سے روکتا ہے۔

یہیں سے عملاً کافر اور مومن کا امتیاز شروع ہوتا ہے۔ کافر، مشرک اور ملحد انھیں چیزوں میں اپنے کو گم کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا اور اس کے علائق ان کی روح کو، ان کے قلب کو، ان کے دماغ کو اپنی اسیری میں اس طرح لے لیتے ہیں کہ وہ انھیں کو حاصلِ زندگی اور منتہائے حیات سمجھنے لگتے ہیں، یعنی شقاوت کے اس درجۂ کمال

پر پہنچ جاتے ہیں جسے قرآن بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا سے تعبیر کرتا ہے۔ اوران کے برعکس مومن اس متاع ارضی کو اپنے دل و دماغ کا معبود نہیں بناتا۔ وہ ان سے ایک فطری رغبت تو ضرور رکھتا ہے مگر یہ رغبت اس کو اصل مقصد حیات سے بے گانہ نہیں کر سکتی۔ جہاں متاع دنیا نے معبودیت کا مطالبہ کیا اور مومن کے لیے وہ "عدوّ" کے حکم میں ہوگئی۔ پھر مومن کا فرض ہوجاتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس "عدوّ" کے حلق پر چھری پھیر دے، خواہ یہ چھری اس رغبت کے ساتھ ساتھ خود اس کے دل کے ٹکڑے ہی کیوں نہ کر ڈالے۔ بیٹے سے بڑھ اس آسمان کے نیچے اور کون سی چیز محبوب بنائی گئی ہے؟ لیکن جب اسی محبوب ترین متاع کو طوفان کی موجیں نگلنے کے لیے لپکتی ہیں اور وقت کا سب سے بڑا خدا پرست انسان باوجود پیغمبرانہ عزیمت کے پدرانہ محبت سے مغلوب ہوکر بیتابانہ کبھی بیٹے کو پکارتا ہے کہ يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا اور کبھی آسمان کی طرف مترحم نگاہیں اٹھاکر کہتا ہے کہ يٰرَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ تو معلوم ہے کہ خدا کی بے نیاز عدالت سے اس درخواست کا کیا جواب ملتا ہے؟ عقیدت اور ممتا کی اس فطری کشمکش پر پیغمبر کو کن لفظوں میں تنبیہ ہوتی ہے؟ صدا آتی ہے کہ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (ہود-۴) اے نوحؑ! بیٹے کے ساتھ تمھاری شیفتگی مسلّم مگر یہ حق و باطل کے امتیاز کا وقت ہے، اس وقت تمھارے بشری جذبات کا اقتضا کوئی چیز نہیں۔ خبر دار جذبات کے طوفان میں تمھارے پائے ثبات و استقامت کو لغزش نہ ہونے پائے اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ حق کی راہ میں جو محبت حائل ہو اس کو دل میں رکھنا جاہلوں کا کام ہے، ایمان کی آزمائش گاہ میں ناکام ہونے والوں کی راہ ہے۔ اس وقت بیٹے کی محبت ایک خطرناک فتنہ کی شکل میں تمھارے سامنے آئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو اپنے پیروں سے کچل کر رکھ دو۔ حق پرستی کا دشمن ہوکر تمھارا بیٹا، تمھارا لختِ جگر ہونے کے باوجود، تمھاری کسی محبت اور سفارش کا مستحق نہیں، حتیٰ کہ وہ اب تمھارا بیٹا بھی نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا تم اپنے اس جگر کے ٹکڑے کو نہنگ اجل کے منہ میں جانے دو۔

اسوۂ ابراہیمی کو لیجیے۔ باپ سے بڑھ کر مخلصانہ ہمدردی اور تعظیم کا مستحق کون ہے؟ لیکن جب توحید پرست بیٹے کو یقین ہو جاتا ہے کہ باپ کی سیاہ فطرت پر شعاع حق کا انعکاس ناممکن ہے تو وہ نہ صرف اس سے ترکِ موالات کرتا ہے بلکہ اس کے لیے ہدایت اور مغفرت کی تمنا بھی اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے، اور باپ بیٹے جیسا گہرا فطری (لیکن مادی) تعلق ایک منٹ کے لیے بھی اس کے ارادہ میں تزلزل نہیں پیدا کرتا۔

اور قریب آئیے، اسوۂ فاروقی پر نگاہ ڈالیے کہ اس سراپائے ایمان کی سیرت بجائے خود حقیقت اسلام کی ایک مکمل اور خالص تصویر ہے۔ بدر کے میدان سے اسیرانِ جنگ گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ دربار نبوت میں معاملہ پیش ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ سب سے پہلے سیدنا عمرؓ کی آواز آتی ہے کہ یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے سامنے یہ سب ہمارے اپنے ہی دست و بازو بلکہ دل و جگر پا بزنجیر کھڑے ہیں لیکن ہیں یہ سب کے سب حق کے دشمن اور توحید سے برگشتہ۔ لہٰذا حکم دیجیے کہ ہم میں سے ہر ایک خود اپنے قریبی عزیز کی گردن مارے۔ کیونکہ ہمارے ان کے لاکھ نسبی اور وطنی تعلقات سہی، مگر ایمان کے دشمن کسی صلہ رحمی، اور ان کی محبت کسی رعایت کی مستحق نہیں۔ اس مشورہ پر خواہ عمل نہ ہوا ہو لیکن اس معاملہ کے متعلق حاکم اعلیٰ کا جو فیصلہ آیا، اس کی روشنی میں کون ہے جو اس مشورہ کی ایمان نوازی اور صحت و عظمت کا منکر ہو سکے۔

اسلام اور ایمان کے ضابطہ میں مادی تعلقات اور بشری جذبات کی قدر اور رعایت جو کچھ ہے بس اتنی ہے۔ اس کے آگے اسلام کی سرحد ختم اور کفر کی مملکت اور اس کا آئین شروع ہو جاتا ہے جہاں یہی دنیا اور اسی دنیا کی لگاوٹیں ہی سب کچھ ہیں۔ ان حدود میں رہنے والے خدا کے پیدا کیے ہوئے ان تمام فتنوں کے سامنے سر جھکائے ان کی پرستش میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور دیدۂ عبرت رکھنے والوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات اپنی جائز حد سے گذرنے کے بعد کس طرح انسان کے دشمن بن جاتے ہیں اور اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ

کی شکل کیا ہوتی ہے۔

خدا کی سنت یہی ہے کہ وہ انھیں فتنوں کے ذریعے اپنے فرمانبردار بندوں اور سرکش و نافرمان باغیوں کو الگ کیا کرتا ہے، اور کسی فرد یا جماعت کو اس وقت تک اپنی مقبولیت کا شرف نہیں بخشتا جب تک کہ وہ فتنوں کی اس بھٹی میں تپا کر جانچ نہ لیے جائیں، اور آزمائشوں سے یہ بات کھل نہ جائے کہ کھرا کون ہے جو اپنے اصلی مقصدِ آفرینش کو یاد رکھتا اور دنیا کے سارے علائق پر اسے ترجیح دیتا ہے، اور کھوٹا کون ہے جو دنیا کے عشق میں سرشار ہو کر اپنے منتہا سے غافل ہو بیٹھا ہے۔ اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا	کیا لوگوں کو گمان ہے کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے پر کہ ہم اللہ پر ایمان لائے،
اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (عنکبوت - ۱)	چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟

یعنی "فتنہ" اور آزمائش کی راہ سے بہرحال گذرنا ہوگا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون مال و اولاد، اعزہ و اقارب اور گھربار کے رشتوں کو اپنی فطری حد میں رکھ کر اللہ کے تعلق کو سب پر بالا و برتر رکھتا ہے، اور کون ایسے فریب کار ہیں جو نام تو توحید کا لیتے ہیں لیکن ان کے قلوب انھیں دنیوی رشتوں کی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، اور ضرورت کے وقت اس گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ	اور ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جان اور پیداوار
وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَ	کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور اے پیغمبر ان مصائب پر صبر کرنے والوں
بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (بقرہ - ۱۹)	اور ہماری آزمائش میں پورا اترنے والوں کو فلاح کی خوشخبری سنا دو۔

اس آیت اور پہلی آیت (زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ) دونوں کو ایک دوسری کی روشنی میں دیکھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ جن چیزوں کی محبت انسانی سرشت میں رکھی گئی ہے انہی میں انسان کی اخلاقی طاقت کے لیے آزمائش بھی رکھ دی گئی ہے اور یہی آزمائش وہ فیصلہ کن چیز ہے جس سے خدا پرست اور دنیا پرست ممیز ہوتا ہے۔ سارے مادی علائق، دنیوی رشتے، اور بشری جاذبے اسی امتحان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ انسانوں میں سے کون اتنا بودا اور کمزور ہے کہ ان کا

بندہ اور پرستار بن کر خدا کی محبت کو ان کی محبت پر سے قربان کر دیتا ہے، اور کس میں اتنی طاقت ہے کہ ان سب چیزوں کو اپنے لیے اور اپنے آپ کو خدا کے لیے سمجھے اور آزمائش کے وقت ہر ایک چیز کو خدا کی خوشنودی کے لیے قربان کر سکے۔ اسی لیے مومن کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اس کی جان اور مال یعنی اس کی پوری دنیا خدا کے ہاتھوں بکی ہوئی ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ-۱۴) اور اگر کوئی مدعیِ ایمان اس ذوقِ تسلیم و رضا سے آشنا نہیں تو وہ نیکی اور تقویٰ کا مقام رفیع ہرگز نہیں پا سکتا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران-۱۰) گویا اسلام نام ہی ہے قربانی کا، یعنی جان اور مال کی قربانی کا، مرغوباتِ نفس اور لذاتِ زندگی کی قربانی کا، مودتِ قربیٰ اور حبِ وطن کی قربانی کا اور ان تمام دنیوی تعلقات اور مادی رغائب کی قربانی کا جن کی کشش اور محبت خالقِ کائنات کی طرف سے انسانی سرشت میں سمو دی گئی ہے، وہی کشش اور محبت جس کے وجود کا اعتراف آیت زُيِّنَ لِلنَّاسِ الخ میں کیا گیا ہے۔

اب ان ساری تفصیلات کے بعد سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ تمام چیزیں، جن کی قربانی کا نام ہی قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے، کس چیز پر قربان کی جانی چاہئیں؟ بالفاظ دیگر انسان کا وہ "منتہائے حیات" اور "اصل مقصدِ زندگی" کیا ہے جس کے مقابل دنیا کی بڑی سے بڑی متاعِ محبوب ناقابلِ التفات اور فراموش ہو جانی چاہیے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے:-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ	اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ	اور تمہارا خاندان اور تمہارا کمایا ہوا مال، اور تمہاری تجارت
وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ	جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے، اور تمہارے دل پسند
كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ	مکانات، یہ ساری متاعِ دنیوی تمہارے نزدیک خدا اور اس کے
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ	رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں،

فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (توبہ۔۳)

تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم اور فیصلہ صادر کرے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

غور فرمائیے، پھر انھیں متاعہائے ارضی کا ذکر ہے جنھیں گذشتہ آیات میں انسان کی مرغوب خاطر ظاہر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی ان اشیاء سے انسان کی فطری دل بستگی کا نہ انکار کیا گیا ہے اور نہ اسے مذموم اور مخالفِ ایمان قرار دیا گیا ہے، بلکہ اشارتاً اس کا وجود بطور حقیقتِ مسلّمہ کے تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ عشق اور طلب اور سعی کا اصلی منتہا صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ جب تک دنیا کی رغبتیں خدا کے اس حق پر اثر انداز نہیں ہوتیں، انسان ان سے تعلق رکھنے میں حق بجانب ہے، اس پر کوئی گرفت اور الزام نہیں۔ لیکن جب یہ مال و دولت، یہ فرزند و زن، یہ خویش و اقارب، یہ نسل و خاندان، یہ دیار و وطن اور یہ سب سامان زندگی انسان کے لیے قفس روح اور زنجیر پا بن جائیں اور یہ محبوب حقیقی کی طلب و دعوت پر اسے حاضر نہ ہونے دیں تو ان سب چیزوں کی محبت حرام ہو جاتی ہے اور یہ حرام محبت کفر کا سرچشمہ ہے، جس طرح خدا کی طلب میں اس محبت کو قربان کر دینا اسلام کا سرچشمہ ہے۔

خدا کی محبت اور عشق ایک باطنی کیفیت کا نام ہے اور اس کی خارجی تفسیر یا اس کا مظہر عبادت ہے، یعنی دائماً خدا کی خوشنودی کے مطابق عمل کرنا۔ اصل شے کو آپ ایمان سے اور اس کے مظہر کو اسلام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی ایمان، انسانی ضابطۂ حیات کی تشکیل میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اساس پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ گذشتہ آیات میں جس چیز کے لیے دنیا اور اس کے تعلقات کی قربانی کا ذکر ہے وہ یہی "اساس" اور یہی "عمارت" ہے۔ قرآن دنیا کی محبوب سے محبوب چیز کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس عمارت کی صحیح تعمیر میں خلل انداز ہو اور اس کی وجہ سے اس میں رخنے پڑیں۔ وہ اسے تو تسلیم کرتا ہے کہ دنیا اور اس کی ساری متاع سے انسان تعلق رکھے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو، اور تسلیم کیا معنی وہ تو اس پر زور دیتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا یہ بھی مطالبہ ہے

کہ جب کبھی ایمان اور اسلام کے مصالح سے اس دنیا کے کسی بڑے سے بڑے تعلق کے مصالح متصادم ہوں تو انسان کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ایسے تعلق کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ توڑ دے خواہ وہ موجودہ تہذیب کا "صنمِ اکبر" ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ دنیا انسان کے برتنے کے لیے بنائی گئی ہے نہ کہ پوجنے کے لیے۔ خادم بنائی گئی ہے نہ کہ آقا۔ تابع اور مسخر بنائی گئی ہے نہ کہ الٰہ اور معبود۔ الدنیا خُلِقت لکم وانتم خلقتم للاٰخرۃ۔

مادی تعلقات اور بشری جذبات کے متعلق قرآن کا اجمالی طور پر یہی اصولی نظریہ ہے۔ آئندہ ہم اسی اصل کی روشنی میں مخصوص طور پر وطنیت کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

امثال القرآن

(۲)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

(۶) کفار کے اعمال کا، اور ان امیدوں کا جو انھوں نے اپنے اعمال کے نتیجہ سے وابستہ کر رکھی ہیں، کیا حشر ہوگا؟ قرآن ایک تمثیل کے پیرایہ میں اس کی توضیح یوں کرتا ہے:۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ (نور - ۵)

اور کافروں کے اعمال کی حقیقت چٹیل میدان کی اس چمکتی ہوئی ریت کی سی ہے جسے پیاسا دور سے دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے قریب آیا تو کچھ نہ پایا۔ البتہ اس نے اللہ کو وہاں موجود پایا جس نے اس کا حساب چکا دیا اور اللہ پل بھر میں حساب لے لینے والا ہے۔ یا ان کے اعمال کی مثال ان تہ بہ تہ تاریکیوں کی سی ہے جو ایک ایسے اتھاہ سمندر میں ہیں جسے موج نے ڈھانک رکھا ہو، پھر اس موج کے اوپر بھی موج ہو اور اس کے اوپر بھی بادل چھایا ہو۔ غرض ایک کے اوپر ایک کئی تاریکیاں جمع ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے۔ اور جسے اللہ ہی روشنی (ہدایت) نہ دے

اسے کہیں سے بھی روشنی نہیں مل سکتی۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں دو مثلیں بیان فرمائی ہیں، ایک دور سے چمکتی ہوئی ریت کی۔ دوسری تہ بہ تہ تاریکیوں کی۔ اس لیے کہ حق و ہدایت سے اعراض کرنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

ایک تو وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے اوہام و خرافات کی بابت یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بے بنیاد نہیں ہیں بلکہ کوئی نہ کوئی بنیاد رکھتے ہیں لیکن جب حقیقت بے نقاب ہوتی ہے تو ان کے گمان کی اصلیت آشکارا ہو جاتی ہے اور خیالات و اوہام کا تار پود بکھر جاتا ہے۔ جاہل بدعتیوں اور ہوا پرستوں کا یہی حال ہو کہ یہ لوگ اپنے اہواء و آراء کو علم و بصیرت اور رشد و ہدایت سمجھے رہتے ہیں، لیکن جب اصل حقائق ان کے سامنے آتے ہیں اس وقت ان پر ان کے ظن بے بنیاد کا راز کھلتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ان کے عقائد اور اُن کے اعمال کی یہ عمارت جو ان بے اصل عقائد کی بنیاد پر کھڑی ہے، ایسی ہی ہے جیسے چٹیل میدان کی چمکتی ہوئی ریت، جو دور سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں پانی نظر آتی ہے اور حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت اور یہی انجام ہے اُن اعمال کا جو نہ اللہ کے لیے کیے گئے ہیں نہ احکام الٰہی کے اتباع میں، ان اعمال کو صاحبِ عمل نجات اور سود و بہبود کا ذریعہ سمجھتا ہے حالانکہ اس غلط توقع کا انجام حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کی بابت حتمی وعدہ بلکہ فیصلہ ہے کہ وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۔

تشبیہ کی بلاغت پر غور کرو! اللہ تعالیٰ نے سراب کے ساتھ "بِقِیْعَۃٍ" کی قید بھی لگائی ہے۔ قیعہ اس چٹیل میدان کو کہتے ہیں جہاں حیوانی اور نباتی وجود کا نام و نشان تک نہ ہو، یعنی محلِ سراب اس سنسان صحرا کو بتایا گیا ہے جو بالکل بے آب و گیاہ اور ہر غیر جمادی وجود سے خالی ہو، اور خود سراب ایک ایسی شئے ہے جو بالکل بے حقیقت و بے اصل ہے۔ اب ان کے اعمال اور قلوب کو، جہاں ایمان و ہدایت کی کسی کرن کا گذر ممکن نہیں، سراب اور اس کے مذکورہ بالا موقع و محل سے مطابقت دو کیسی چول سے چول بیٹھ جاتی ہے۔ جس طرح اس محل سراب میں کسی چیز کا وجود نہیں اسی طرح ان کے دلوں میں آفتابِ ہدایت کی کرنوں کا گذر نہیں، اور جس طرح

سراب کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح ان کے اعمال بھی فریب محض ہیں جن سے انھیں توقعات تو بہت ہیں مگر وقت پر ان کے لیے سراب کی طرح معدوم الحقیقت ثابت ہوں گے۔

پھر "یَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً" کی قید مزید پر غور کرو۔ "ظمان" اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت پیاسا ہو۔ ایسا شخص پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر پاس آتا ہے اور وہاں کچھ نہیں پاتا بلکہ تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کفار کا یہی حال ہو گا ان کے اعمال غیر اللہ کے لیے ہونے اور اطاعتِ رسول پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سراب کے مشابہ ہیں۔ جس طرح پیاسا آدمی چمکتی ہوئی ریت کی طرف، پانی سمجھ کر لپکتا ہے اور ناگہانی یاس و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اسی طرح میدان حشر میں کفار نہایت احتیاج کی حالت میں، بڑی امیدوں کے ساتھ اپنے اعمال کی طرف بڑھیں گے لیکن اعمال کا کہیں نام و نشان نہ ہو گا البتہ خدا موجود ملے گا اور ان کا حساب چکا دے گا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ باری تعالیٰ کی (قیامت کے دن) تجلی کا ذکر کرتے ہوئے آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

"پھر جہنم لا کر پیش کی جائے گی جس کی شکل بالکل سراب کی سی ہو گی۔ اور یہود سے سوال ہو گا کہ تم نے کس کی عبادت کی؟ کہیں گے خدا کے بیٹے عزیر کی، کہا جائے گا تم جھوٹے ہو، خدا کے نہ بیوی تھی نہ بیٹا۔ اچھا اب کیا چاہتے ہو؟ کہیں گے، پانی پینا۔ کہا جائے گا جاؤ پیو۔ چنانچہ وہ جہنم کی طرف ٹوٹ پڑیں گے۔ پھر نصاریٰ سے خطاب ہو گا، تم نے کس کو پوجا؟ جواب دیں گے مسیح خدا کے بیٹے کو۔ کہا جائے گا تم جھوٹ بکتے ہو، خدا بیوی، بیٹے والا کب تھا۔ کہو اب کیا چاہتے ہو؟ کہیں گے سیراب ہونا۔ حکم ہو گا جاؤ پیو۔ سو وہ بھی دوزخ میں گرے جا رہے ہوں گے الخ"

ہر باطل پرست کا یہی حال ہو گا یعنی باطل اس کے ساتھ اس وقت غداری کرے گا جبکہ اسے مدد کی سخت ضرورت ہو گی کیونکہ باطل کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی، اس کا مسمّیٰ بھی ویسا ہی باطل ہوتا ہے جیسا کہ اس کا اسم۔ پس جب اعتقاد میں حق کی مطابقت نہ پائی جائے گی تو اس سے جو چیز متعلق ہو گی وہ بھی باطل ہو گی۔ اسی طرح عمل کی غرض و غایت اگر باطل ہو

مثلاً عمل خالصۃً لوجہ اللہ نہ ہو یا احکامِ الٰہی پر مبنی نہ ہو، تو وہ باطل ہوگا اور عمل کرنے والا اپنی توقع کے خلاف اس کی بدولت مضرت سے دوچار ہوگا۔ نیز اس کے اعتقاد و عمل کی طرف سے غفلت نہ ہوگی کہ مالہ وما علیہ کا فرق و امتیاز کئے بغیر فیصلہ ہو جائے بلکہ اسے نفع سے محروم رہنا اور مضرت و عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔ وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔

یہ اس گم کردہ راہ جماعت کی تصویر و تمثیل تھی جس نے غلط گمان کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدایت اور راہ راست پر سمجھا تھا۔ اب منکرین حق کی دوسری قسم کو لو جس کے حالات کی تشبیہ ظلماتِ بحر سے دی گئی ہے۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو حق اور رشد و ہدایت کو جان پہچان کر ترک کر دیتے اور باطل ہی کی تاریکیوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر ایک دو نہیں کئی طرح کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ ایک طرف سے فطرت کی ظلمت کا شکار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف روح کی ظلمت کا۔ تیسری سمت سے جہل کی تاریکی مسلط ہوتی ہے (کیونکہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، انجام کار جہل کا زنگ ان پر بیٹھ جاتا ہے) اور چوتھی طرف اتباع ہوا کی۔ ان تہ بہ تہ ظلمتوں میں گھر جانے کے بعد ان کا حال ٹھیک اس شخص کے مشابہ ہو جاتا ہے جو ایک ایسے دریائے ناپیدا کنار میں جا پہنچا ہو جس میں لہروں پر لہریں اُٹھ رہی ہوں اور ساتھ ہی اوپر سے سیاہ بادلوں کی تاریکی بھی اس پر چھائی ہوئی ہو یعنی اس پر تین طرح کی تاریکیاں بیک وقت چھائی ہوئی ہوں، دریا کی تاریکی، موجوں کی تاریکی، اور بادل کی تاریکی۔ غور کرو، انھیں تاریکیوں کے مشابہ کفار کے قلوب کی تاریکیاں بھی ہیں۔ فطرت کی تاریکی، روح کی تاریکی، اور دماغ کی تاریکی۔

سراب (جسے دور سے پانی یعنی مادۂ حیات سمجھا گیا) اور ظلمات (جو نور کی ضد ہے)، کی یہ دونوں مثلیں اُن دونوں (ناری و مائی) مثلوں کے مشابہ ہیں جو منافقین اور مومنین کے بارے میں اوپر بیان کی جا چکی ہیں اور جن میں مومنین کا حصّہ "زندگی" اور "نور" دکھایا گیا ہے اور منافقین کا حصّہ ان کے برعکس ظلمت اور ذوت کی ہولناکی بتائی گئی ہے۔ یہی حالت منکرین و منافقین کی زیر بحث مثلوں میں بھی بیان ہوئی ہے کہ پانی کی تلاش میں انھیں سراب ملا جو دھوکے سے پانی نظر آرہا تھا اور جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، اسی طرح نور کے بجائے ظلمت،

جو ایک طرح کی روحانی موت ہے، ان کے مقدر میں نکلی۔

ہو سکتا ہے کہ اس تمثیل میں بحیثیت مجموعی کفار کی تمام جماعتوں کی حالت کی طرف اشارہ ہو اور ان سب کی اس مشترک بدبختی کا اظہار مقصود ہو کہ انھوں نے وحی الٰہی کی طرف اعتنا اور توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "روح حیات" اور "نور" سے محروم ہو گئے (کیونکہ قرآن وحی کو روح اور نور سے تعبیر کرتا ہے) اس صورت میں یہ دونوں مثلیں ایک ہی موصوف کی دو صفتیں ہوں گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کفار کے مختلف گروہوں کا الگ الگ حال بیان کرنا مقصود ہو۔ اس صورت میں پہلی مثل ان لوگوں سے متعلق ہو گی جنھوں نے علم و بصیرت کی روشنی کے بجائے محض ظن اور جہل اور اپنے اسلاف کے حسن ظن پر اپنے اعمال کی بنا رکھی، اور آخر دم تک یہ سمجھتے رہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں نہایت ہی بہتر کر رہے ہیں، یعنی گمراہی کے باوجود انھیں اپنے حسن عمل کا پورا یقین تھا۔ اور دوسری مثل اس جماعت کے بارے میں ہو گی جس نے ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کی، اور حق و صداقت پر باطل کو ترجیح دی اور حق اور ہدایت کا چہرہ دیکھنے کے بعد اندھے بنے یعنی حق کو پہچان کر انکار کی شقاوت میں مبتلا ہوئے دونوں گروہوں کا فرق ظاہر ہے۔ پہلا گروہ ضالین کا ہے اور دوسرا مغضوب علیہم کا۔ اور ان دونوں گروہوں کا حال اس مُنعَم علیہ گروہ کے حال سے بالکل مختلف بلکہ مقابل ہے جس کا ذکر آیۃ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الخ میں کیا گیا ہے۔ اس پورے سلسلے کو سامنے رکھو تو معلوم ہو گا کہ ان آیات میں تینوں جماعتوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، ایک تو وہ گروہ ہے جس کے لیے نور کی مثل بیان کی گئی ہے۔ دوسری جماعت ضالین کی ہے جو ضلالت کی تاریکیوں میں ٹھوکر کھاتی رہی، جس کے لیے سراب کی مثال دی گئی ہے۔ اور تیسری جماعت مغضوب علیہم کی ہے جس پر خدا کی پھٹکار اور غضب کی لعنت پڑی۔ "اَوْ کَظُلُمٰتٍ" میں انھیں کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ مختصر لفظوں میں ان تینوں گروہوں کا نام، اہلِ نور، اہلِ سراب، اور اہل ظلمات رکھا جا سکتا ہے۔ پس ان دونوں مثالوں میں پہلی مثل ارباب عمل باطل کی ہے جنھوں نے عمل باطل کا نفع اور فائدہ سے بالکل خالی، ذخیرہ جمع کیا۔ اور دوسری ان اصحاب علم باطل کی ہے جنھوں نے علم حق کو چھوڑ کر غلط اعتقاد اور فاسد اور غیر نافع علم اختیار کیا۔

اور یہ دونوں چیزیں، باطل عمل اور باطل علم، دینِ حق سے فطری تضاد رکھتی ہیں۔ اسی وجہ اللہ تعالیٰ نے فریق ثانی کے شکوک وشبہات اور علوم فاسدہ سے گھرے ہوئے دلوں کی تشبیہ اس دریا کی متلاطم حالت سے دی ہے جس میں موجیں اُٹھ رہی ہوں اور تہ بتہ بادلوں کی تاریکی بھی اوپر سے مسلط ہو کیونکہ بعینہٖ یہی تصویر ان تاریک اور مضطرب دلوں کی ہیئت نفسی کی ہوتی ہے جن کے اندر شکوک وشبہات کے دریا موجزن ہوتے ہیں، اور جن پر دانستہ گمراہی، ہوا پرستی اور باطل کا سیاہ ابر بھی محیط ہوتا ہے۔ اگر علم وبصیرت کے ساتھ ان دونوں مثلوں پر اور کفار کی ہیئتِ نفسانیہ سے ان کے کمال تطابق پر غور کیا جائے تو فطرتِ انسانی قرآن کی عظمت وجلالت کے سامنے سر اعتراف جھکا دے گی اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اسی ذاتِ واحد کا کلام ہو سکتا ہے جو ہر طرح کی ستائشوں اور تعریفوں کی تنہا مستحق اور تمام حِکَم واسرارِ فطرت کی تنہا راز داں ہے۔

(۷) کفر کے ناممکن العلاج مریضوں کی حالت کی مثال:۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ	یا تم خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں،
اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ	یہ تو بالکل چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی
هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (فرقان۔ ۱۴)	گئے گذرے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نسل انسانی کے کج فطرت طبقہ کی تشبیہ چوپایوں سے دی ہے۔ وجہ مشابہت ہدایت کا عدم قبول ہے جس میں دونوں گروہ یکساں طور پر شریک ہیں۔ یہ لوگ باطنی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور فہم وادراک کی صلاحیت فنا کر کے جہل کے قالب میں ایسے ڈھل گئے ہیں کہ گویا حیوانات کی طرح انھیں سرے سے عقل وہوش اور بصیرتِ قلب کی استعداد حاصل ہی نہیں ہوئی۔ پھر اس تشبیہ کے بعد قرآن نے ان لوگوں کو جانوروں سے بھی زیادہ جادہ فراموش اور شاہراہِ ہدایت سے دور بتایا ہے، کیونکہ بہائم وانعام اگرچہ ایک بے عقل وخرد مخلوق ہیں لیکن پھر بھی چرواہے کی رہنمائی کے ذریعہ صحیح راہ انھیں مل بھی جاتی ہے، جسے وہ اختیار کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے اور نہ زیادہ تردد میں باہیں کترانے کی کوشش کرتے

ہیں لیکن حضرت انسان کو دیکھو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ان کو حق و معرفت کی تلقین کرتے، ہدایت کی راہ سمجھاتے اور نجات کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور اس دعوت کو قبول کرنے کے بجائے الٹے اس کے دشمن بن جاتے ہیں، اور اپنے نفع نقصان تک کی تمیز روا نہیں رکھتے کہ جو چیز ان کی نوع (انسانیت) کے لیے مفید ہو اسے اختیار کریں اور جو چیز اس کے لیے مہلک ہو اسے ترک کر دیں لیکن حیوان پھر بھی باایں ہمہ حیوانیت اپنے بھلے برے کی تمیز کرتا ہے، مضر نباتات اور مہلک پودوں کے کھانے اور خطرناک راستوں پر چلنے سے پوری طرح اجتناب کرتا ہے، حالانکہ خداوند عالم نے اس کو قلب ایسا دیا ہے جس میں فہم و بصیرت کی روشنی مفقود ہے اور زبان ایسی دی ہے کہ نطق و گویائی سے قطعاً محروم۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ان تمام نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے جو ان کے لیے ہر قدم پر دلیلِ راہ بن سکتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ان سے فائدہ اٹھانے اور ہدایت و معرفت کی سعادت حاصل کرنے سے محروم ہی رہے، اور عقل کی روشنی، قلب کی بصیرت، زبان کی گویائی، کان کی سماعت اور آنکھ کی بصارت رکھتے ہوئے بھی انھوں نے ان تمام آلاتِ تمیز سے حق و باطل کی راہیں متعین کرنے اور کھرے کھوٹے کو پہچان لینے میں کام نہ لیا۔ پھر وہ حیوانات سے بھی زیادہ گمراہ اور "اضل" کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ جو ہاتھوں میں چراغ رکھتا ہو اور اس کے باوجود گڑھے میں جا گرے وہ اس شخص کی بہ نسبت بہت زیادہ قابلِ ملامت ہے جو بغیر چراغ کے ٹھوکر کھائے۔

(۸) شرک کی نامعقولیت:۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (روم - ۴)

اللہ تمھارے سامنے خود تمھارے اپنے ہی حال سے ایک مثال بیان کرتا ہے۔ جن غلاموں کے تم مالک ہو کیا ان میں سے کوئی بھی اس روزی میں، جو ہم نے تم کو دے رکھی ہے، تمہارا شریک ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر کا حق رکھتے ہو، اور ان سے بھی ویسا ہی اندیشہ رکھتے ہو جیسا اپنے (جیسے آزاد حق تصرف رکھنے والوں) سے؟ ایسا ہی

ہم سمجھنے والوں کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کرتے ہیں۔

آیتِ کریمہ میں جس دلیل سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بے بنیاد مسلک کے خلاف استدلال کیا ہے اسے اصطلاح میں دلیل قیاس کہا جاتا ہے۔ استفہاماً ان کے غلاموں کو ان کا شریک و سہیم قرار دے کر ان کے خلاف ایسی حجت قائم کی ہے جس کی صحت کے وہ کلی طور پر ایسے معترف ہیں کہ ان کے دماغ میں کبھی اس کی غلطی کا وہم بھی نہیں گذرتا۔ اور یہ دلیل و حجت کا بہترین و بلیغ ترین اسلوب ہے کہ مخالف پر خود اسی کے مسلمات اور بدیہی کلیات سے حجت قائم کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ان نادان انسانوں سے خطاب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارے یہ غلام اور لونڈیاں جو تمہارے دستِ تصرف میں ہیں کیا یہ تمہارے مال و متاع میں شریک ہیں؟ کیا اپنے ان ممالیک کے متعلق تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ تمہاری جائداد میں یہ مساویانہ حصہ داری رکھتے ہیں؟ اور اس تصور کے تحت تمہارے دلوں میں کبھی یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کبھی وہ تمہارے مال و متاع میں سے اپنا حصہ بٹا لیں گے یا اپنے حصے سے زائد تمہارا حق بھی مار لیں گے، جس طرح کہ ایک شریک دوسرے شریک سے عموماً خوف و بے اطمینانی محسوس کیا کرتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے "تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ" کی تاویل یہ فرمائی ہے کہ کیا تم کو ان غلاموں سے یہ اندیشہ اور خوف ہے کہ وہ تمہارے مال و اسباب کے وارث ہو جائیں گے جس طرح کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ترکہ میں حق وراثت حاصل ہوتا ہے؟ بہرکیف آیت کا مقصد یہ ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اس بات پر راضی ہوگا کہ اس کا غلام اس کے سرمایہ اور اہل و اولاد میں شریک ہو حتیٰ کہ اس کے برابر حق تصرف رکھے، اور اس حق تصرف کی وجہ سے اسے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں وہ (غلام)، موقع پا کر ساری ملکیت پر ہی نہ قابض ہو جائے، جیسا کہ برابر کے شرکاء میں یہ خطرہ ہر دم موجود رہتا ہے؟ اگر تم اس پر راضی نہیں اور نہ کبھی ایسی نامعقول بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو تو پھر وہی بات میرے لیے کیوں پسند کرتے ہو؟ اور میری مخلوقات کو، جو میرے حلقۂ غلامی میں ہیں، کیونکر میرا ہمسر اور ہم پایہ قرار دیتے ہو؟ اور جبکہ غلام و آقا کی اس مساوات کے تخیل کو تمہاری عقل اور فطرت بداہتہً غلط سمجھتی ہے (حالانکہ تمہارے حق میں اس کا بہت کچھ امکان بھی ہے اس لیے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو تمہارے

غلام تمہاری ملک کسی طرح نہیں ہیں، بلکہ در اصل وہ تمہارے برابر کے بھائی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے قبضۂ اقتدار میں دے رکھا ہے، اس لیے محض عرضی طور پر نہ کہ حقیقی طور پر دونوں کے مرتبے جداگانہ ہو گئے ہیں اور دونوں کو مجازاً "آقا" اور "غلام" کے الگ الگ نام مل گئے ہیں، ورنہ حقیقتاً تم اور تمہارے غلام دونوں کے دونوں ہی کسی اور ہی حقیقی آقا کے غلام اور بندے ہیں) تو میرے حق میں تمہارا ضمیر اسی تخیل کے تسلیم کرنے کی اجازت کیوں کر دیتا ہے حالانکہ وہ تمام کے تمام میرے ہی بندے، میری ہی ملکیت اور میری ہی مخلوق ہیں جن کو تم نے میرا ہم پایہ و ہم مرتبہ اور شریک بنا رکھا ہے؟ یہ ہے تفصیل آیات۔ یعنی کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ کا مطلب۔

(۹) ابطالِ شرک :۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (نحل ۔ ۱۰)

خدا نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک غلام ہے دوسرے کی ملک جو کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ہے (خود مختار) جس کو ہم نے اپنی سرکار سے اچھی روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے کچھ چھپ کر اور کچھ کھلے طور پر خرچ کرتا ہے کیا ایسے دو شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ (یہ مثال سُن کر مشرکین ضرور "نہیں" پکار اٹھیں گے) الحمد للہ کہ اتنا تو سمجھے، لیکن ان میں سے بہتیرے ایسے بھی ہیں جو (اتنا بھی) سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور خدا نے (ایک دوسری) مثل دو آدمیوں کی بیان فرمائی ان میں کا ایک گونگا (اور کسی کا غلام بھی) ہے جو کچھ نہیں کر سکتا (نیز) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کوئی بھی ٹھیک نہیں بن آتا۔ کیا ایسا غلام اور وہ جو عدل کا حکم کرتا ہے اور خود بھی سیدھی راہ پر ہے، برابر ہو سکتے ہیں۔

ان آیات میں قرآن نے دو مثلیں بیان کی ہیں اور دونوں میں استدلال کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسے اصطلاح میں قیاس عکس کہا جاتا ہے یعنی کسی شے سے علتِ حکم کی نفی کر کے اصل حکم کی نفی کرنا۔ کیونکہ قیاس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو قیاس عام جس میں ثبوت علت کی وجہ سے فرع میں اصل کا حکم لگایا جاتا ہے۔ دوسرا قیاس عکس، جس میں

نفی علت کی وجہ سے فرع سے اصل کے حکم کی نفی کی جاتی ہے۔ یہاں اسی طرز استدلال سے زیر بحث مثلوں میں کام لیا گیا ہے۔

پہلی تمثیل اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور شانِ ملوکیت، اور بتوں کے عجز اور بیکسی کی دی ہے۔ اور بت پرستی کی نامعقولیت پر روشنی ڈالی ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ، عالم کی تمام اشیا، کا مالک کل اور ذرہ ذرہ کا فرمانروا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے مخفی طور پر، اور کھلے بندوں شب روز اپنے بندوں کو انواع و اقسام کی نعمتوں سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے حد وحساب دے ڈالتا ہے۔ اس کا خزانۂ رزق اتنا وسیع اور لامحدود ہے کہ شبانہ روز کی پیہم بخششوں اور فیاضیوں کے باوجود بھی کم ہونے والا نہیں۔ اس کے برعکس اصنام و اوثان ایک محکوم اور درماندہ مخلوق ہیں جن کو کسی چیز پر بھی قدرت و اختیار نہیں تو پھر مشرکین کو کیا ہو گیا ہے کہ اس عظیم الشان اور روشن از آفتاب فرق کے باوجود، کہ میں قادر مطلق ہوں اور یہ بت مجبور محض، میں مالک ہوں اور یہ مملوک، وہ کس طرح ان بے بس اور درماندہ مورتوں کو میرا شریک وہمتا سمجھتے ہیں۔ اور مجھے چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔

آیت کی یہ تاویل امام مجاہد وغیرہ نے کی ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک دوسری تاویل بیان فرمائی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اور معبودانِ باطل کی مثال نہیں دی ہے بلکہ مومن اور کافر کی دی ہے، اور بتایا ہے کہ صالح مومن کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اللہ کی طرف سے بہترین رزق سے نوازا گیا ہے جسے وہ اپنے مصارف میں بھی خرچ کرتا ہے اور دوسروں کی بھی، چھپ کر اور برملا، ہر طریقہ سے حاجت روائی کرتا ہے۔ بخلاف اس کے خیر و صلاح سے عاری کافر کی مثال اس بیکس اور زیر اقتدار غلام کی سی ہے جو مجبور محض اور بالکل ہی قدرت واختیار سے محروم ہے اور جو ایک حبہ بھی خرچ کرنے پر قادر نہیں۔ کیونکہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ اس توضیح اور تفریق کے بعد سوال کرتا ہے کہ کیا کسی صاحب عقل کے نزدیک یہ دونوں یکساں اور ہم پلہ ہو سکتے ہیں؟

آیت کی یہ دو تاویلیں کی گئی ہیں لیکن پہلی تاویل زیادہ معنی خیز اور لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل مقصد یعنی ابطال شرک کے لیے یہ زیادہ مؤثر بھی ہے اور واضح بھی۔ اور نظم کلام بھی اسی کا مقتضی ہے، چنانچہ اس سے پہلے آیت وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ہے جس میں شرک کی بے بنیادی ثابت کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ہی ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ الخ کی تمثیل بیان کی گئی ہے جس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ تمثیل آیت ماسبق کی توضیح ہے۔ ہاں اس مثل سے لازمی طور پر یہ مفہوم بھی خود بخود کھل جاتا ہے کہ توحید پر کامل اعتقاد رکھنے والے مومن کا حال اس شخص کا سا ہے جس کو بارگاہِ خداوندی سے رزق کا بہترین حصہ ملا ہو اور اس کو اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا اختیار حاصل ہو، اور کافر مشرک کی مثال اس زیر اقتدار اور مملوک غلام کی سی ہے جس کو کچھ بھی قدرت و اختیار حاصل نہیں لیکن یہ آیت کا اصل معنی نہیں ہے بلکہ بطور اشارۃ النص کے اس سے یہ مفہوم بھی ضمناً نکلتا ہے۔ لہذا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فرمانا کہ اس مثل میں مومن و کافر کی حالت بیان ہوئی ہے، درحقیقت اسی حقیقت کا حامل ہے اور ان کے کہنے کا مقصد یہی ہے کہ ابطال شرک کے ساتھ ساتھ مومن و کافر کی واقعی حیثیت بھی اشارۃً اس آیت سے روشنی میں آجاتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ آیت کا اصلی اور متعین مفہوم ہی یہی ہے۔ اور قرآن کے فہم اور اس کی تفسیر کا یہ بھی ایک عام انداز ہے جس کی تائید چاہو تو قدماء کے اقوال کی طرف مراجعت کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دیگر سلفِ صالحینؒ کے اقوال میں تو اس کی بے شمار نظیریں موجود ہیں۔ وہ اکثر آیات میں ان کے اصل معانی کو بیان کرنے کے بجائے ان کے لوازم اور ضمنی احکام پر اشارہ کر کے خاموش ہو جاتے ہیں لیکن عام لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ آیات کی متعین تاویل ان کے نزدیک یہی ہے، اور اس کوتہ نظری کی وجہ سے لوگ اقوالِ سلف کو تفسیر آیات کی حیثیت سے پیش کرنے لگتے ہیں۔

تقریظ و انتقاد

"متحدہ قومیت اور اسلام"

اس عنوان سے جناب مولانا حسین احمد صاحب صدر دار العلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے[1]، اور ہمارے پاس تنقید کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایک نامور عالم دین، اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنف کا جو مرتبہ ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ اس رسالہ میں "قومیت" کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہوگی، اور اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو اپنی توقعات سے اور مصنف کی ذمہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔

یہ ایسا زمانہ ہے جس میں جاہلی تصورات نے ہر طرف سے اسلامی حقائق پر زغہ کر رکھا ہے، اور اسلام اپنے گھر ہی میں غریب ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ خالص اسلامی نگاہ سے مسائل کو نہیں دیکھتے، اور کمی علم کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر قومیت کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اسی کے صاف اور واضح فہم و ادراک پر ایک قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی قومیت کے اساسیات ہی کو اجنبی اصول و مبادی میں خلط ملط کر دے تو وہ قوم سرے سے قوم ہی نہیں رہ سکتی۔ ایسے نازک زمانے میں ایسے نازک مسئلے پر قلم اٹھاتے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب جیسے شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ امانت انبیاء کے امین ہیں اور جب اسلامی حقائق جاہلیت کے گرد و غبار میں چھپ رہے ہوں تو یہ انہی جیسے لوگوں کا کام ہے کہ انھیں صاف اور منقح کر کے روشنی میں لائیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ اس فتنہ کے دور میں ان کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی ذمہ داری

[1] مجلس قاسم المعارف دیوبند سے ۸ر میں مل سکتا ہے

سے زیادہ سخت ہے اور اگر مسلمان کسی گمراہی میں مبتلا ہوں تو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر وہی ماخوذ ہونے والے ہیں۔

لیکن ہمیں پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کا یہ رسالہ اس ذمہ داری کے احساس سے بالکل خالی ہے۔ اس میں مسئلے کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، جن الجھنوں میں یہ مسئلہ اس وقت الجھا ہوا ہے ان کو سلجھانے کے بجائے فاضل مصنف خود انہی میں الجھ گئے ہیں، اور انھوں نے اپنا تمام تر زور صرف اس پر صرف کر دیا ہے کہ "متحدہ قومیت" کو محض لفظی حیثیت سے ایک اسلامی چیز ثابت کر دکھائیں، بلا اس لحاظ کے کہ معنی اور مآل کے اعتبار سے بھی وہ اسلامی ہو یا نہ ہو۔

غیر علمی زاویۂ نظر ایک مصنف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش کرنا چاہیے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے اس لیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنف کا برتاؤ، اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا، تمام تر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے کہ آدمی محض امر حق کا طالب ہو اور مسئلے کو، جیسا کہ وہ فطرۃً وحقیقۃً ہے، اس کے اصلی رنگ میں دیکھے، اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر بھی پہنچاتا ہو اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے کہ وہ کس کے خلاف پڑتا ہے اور کس کے موافق۔ یہ بحث وتحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے اور اسلامی زاویۂ نظر بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ اسلام کی روح ہی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔ اس سیدھے زاویۂ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے زاویائے نظر بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں، اس لیے صرف اسی نتیجہ کی طرف جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو، اور دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض وعداوت ہے اس لیے آپ کو تلاش صرف انہی چیزوں کی ہے جو آپ کے مبغوض کی مخالف ہوں۔ اس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلافِ حق ہیں۔ انھیں اختیار کر کے کوئی بحث کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ کسی عالم اور متقی انسان کے لیے زیبا نہیں کہ ایسے کسی زاویہ سے کسی مسئلے پر نگاہ ڈالے اس لیے کہ یہ "اسلامی" نہیں بلکہ "جاہلی" زاویۂ نظر ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ مولانا نے اس رسالہ میں کونسا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے۔ اپنی بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ضروری معلوم ہوا کہ . . . . ان غلطیوں کا ازالہ کر دوں جو اس قسم کی قومیتِ متحدہ سے ممانعت اور

اس کو خلافِ دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہل ہندوستان سے بنا بر وطنیت اس اتحاد قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جد و جہد عمل میں لا رہی ہے۔ اور اس کے مقابل و مخالف قوتیں اس کے غیر قابل قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۵۷ء یا اس سے پہلے سے لائی گئی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کی وحی ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر عمل میں لائی جا رہی ہے۔" (صفحہ ۵-۶)

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں :-

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جن کو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جن کے دماغ اور قلب برطانوی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں امید نہیں ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔"

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ وہ ایسے تھے اور ایسے تھے مگر "باوجود کمالات گوناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے۔"

پھر ایک طویل بحث کے بعد اپنے زاویۂ نظر کا صاف صاف اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لیے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو کہ ہم نے پروفیسر سیلے کے مقالہ سے نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبۂ ضعیف سا ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت موجود بھی نہ ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراک عمل شرمناک امر ہے، انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔" (صفحہ ۳۸)

آگے چل کر ایک ایسی حیرت انگیز رائے کا اظہار فرماتے ہیں جسے پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی متقی عالم کی تحریر ہو سکتی ہے :-

"اگر وطنیت ایسی ہی ملعون اور بدترین چیز ہے تو چونکہ یورپ نے اس کو استعمال کر کے اسلامی بادشاہوں اور عثمانی خلافت کی جڑ کھودی ہے، مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ اسی ملعون ہتھیار کو برطانیہ کی جڑ کھودنے کے لیے استعمال کرتے۔" (صفحہ ۳۸)

اسی بحث کے دوران میں مولانا پہلے تو اس امر کا اعتراف فرماتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں اسلامی سلطنتوں کو جس قدر بھی نقصان پہنچا ہے اسی وجہ سے پہنچا ہے کہ یورپ نے اسلامی وحدت کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا، "اور مسلمانوں میں نسلی، وطنی، لسانی امتیاز و افتراق پیدا کر دیا" اور ان میں یہ اسپرٹ پیدا کی کہ "جہاد مذہبی و روحانی نہ ہو بلکہ نسلوں اور اوطان کے لیے کیا جائے اور مذہبیت کی اسپرٹ درمیان سے نکال دی جائے" (صفحہ ۳۵-۳۶) لیکن امر حق کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد پھر وہی برطانیہ کا ہوّا مولانا کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ :-

"افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور ان؟ وطنیت و نسل و زبان وغیرہ کا واعظ کھڑا نہ ہوا اور نہ یورپ کے اخباروں رسائل، لکچراروں کی بے حد و بے شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصہ پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گیا اور ممالک اسلامیہ یورپین اقوام کے لقمۂ تر بن کر رہ گئے۔ اب جبکہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیا وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے، وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے۔" (صفحہ ۳۶-۳۷)

یہ عبارات جنھیں اوپر لفظ بلفظ نقل کیا گیا ہے مولانا کے زاویۂ نظر اور ان کے اندازِ فکر کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولانا کی نگاہ میں حق اور باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا ہے۔ حق وہ ہے جو برطانیہ کے خلاف ہو اور باطل ہر وہ چیز ہے جس کے متعلق یہ وہم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کی اغراض کے لیے مفید ہے۔ وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقائق اپنے اصلی رنگ میں انھیں نظر آ سکیں، نہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے زاویۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زہر ہے وہ انھیں زہر دکھائی

دے سکے۔ ان دونوں زاویوں کے بجائے ان پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویۂ نظر مستولی ہوگیا ہے جس کی وجہ سے ہر وہ چیز ان کو تریاق نظر آتی ہے جس کے متعلق کسی طرح ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کے لیے زہر ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسی چیز کو مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کی مخالفت کرے تو وہ ان کے نزدیک برطانیہ پرست کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان کو مسلمانوں کی زندگی سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی برطانیہ کی موت سے ہے۔ اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیے مہلک ہے تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ برطانیہ پرست کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے! ——— خیریت یہ ہوگئی کہ کسی نے مولانا کو برطانیہ کی ہلاکت کا ایک دوسرا نسخہ نہ بتادیا جو متحدہ قومیت سے بھی زیادہ کارگر ہے، یعنی یہ کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی یک بارگی خودکشی کرلے جس سے برطانوی سلطنت آن کی آن میں ختم کی جاسکتی ہے۔ یہ تیر بہدف تدبیر اگر مولانا کے دل میں بیٹھ جاتی تو وہ بے تکلف فرماتے کہ جو شخص ہندوستان کے باشندوں کو خودکشی سے روکتا ہے وہ برطانیہ پرست ہے۔ خودکشی اگرچہ "ملعون" اور "بدترین فعل" سہی، مگر جب کہ اس سے برطانیہ کی جڑ کھودی جاسکتی ہے تو فرض ہو جاتا ہے کہ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا جائے! ——— ایسی ہی باتوں سے یہ راز سمجھ میں آتا ہے کہ دین میں الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کو معیارِ حق کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اگر خدا کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے اور بجائے خود کوئی شے محبوب یا مبغوض بن جائے تو عصبیت جاہلیہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے جس میں وہ تمام ذرائع و وسائل جائز کر لیے جاتے ہیں جن سے انسان کے جذبات محبت و عداوت کی تشفی ہو سکے، قطع نظر اس کے کہ وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہوں یا اس کے خلاف۔ اسی لیے کہنے والے نے کہا کہ ذاتی عداوت تو شیطان سے بھی نہ ہونی چاہیے۔ اس میں بھی خدا کا واسطہ بیچ میں رہنا ضروری ہے ورنہ وہ خود ایک قانون بن جائے گی اور تم شیطان کی دشمنی میں خدا کے حدود توڑ دو گے، یعنی اپنے دشمن شیطان ہی کا کام کرو گے۔

اثبات مدعا کے لیے حقائق سے چشم پوشی

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے مشہور اور بیّن واقعات کو بھی صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں میں نسلی، وطنی اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا؟ کیا ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ،

مصطفیٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، جلال نوری بے، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمود الحسن، محمد علی، شوکت علی، اقبال، ابوالکلام مرحوم، کسی کا نام بھی مولانا نے نہیں سنا؟ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ یہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیے برپا کرائی جا رہی ہے؟ شاید مولانا ان سوالات کا جواب نفی میں نہ دیں گے۔ مگر وہ ان سب واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بے تکلف دعویٰ فرماتے ہیں کہ "افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا واعظ کھڑا نہ ہوا"۔۔۔۔ ایسا غلط دعویٰ کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی؟ مقصود صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ پہلے مسلمانوں کی قومی وحدت برطانوی مفاد کے خلاف تھی اس لیے سب مسلمان نسلی، وطنی اور لسانی امتیازات پھیلانے میں لگے ہوئے تھے، اور اب اسلامی وحدت برطانوی اغراض کے لیے مفید ہو گئی ہے، اس لیے اس کا وعظ بھی شروع ہوا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ وطن پرستی کے مخالف سب کے سب برطانیہ پرست ہیں اور محض ساحر برطانیہ کا سحر ان کے اندر بول رہا ہے!۔۔۔۔ یہ ہے نتیجہ عصبیت جاہلیہ کا۔ چونکہ حق و باطل کا معیار "برطانیہ" ہو گیا اس لیے خلاف واقعہ باتوں کی تصنیف بھی جائز ہو گئی اگر ان سے برطانیہ کے خلاف کوئی کام لیا جا سکے۔

یہی ذہنیت ہے جو ہمیں پورے رسالہ میں کارفرما نظر آتی ہے۔ لغت کو، آیات قرآنی کو، اخبار و احادیث کو، تاریخی واقعات کو، غرض ہر چیز کو توڑ مروڑ کر اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ہر اس چیز کو بلا تکلف نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مدعا کے خلاف ہو، چاہے وہ کیسی ہی ظاہر و باہر حقیقت کیوں نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ لفظی مغالطے دینے اور قیاس مع الفارق اور بناء فاسد علی الفاسد کا ارتکاب کرنے میں بھی تامل نہیں فرمایا گیا۔ ایک عالم اور متقی عالم کا یہ کارنامہ دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ اسے کیا کہیے۔

قومیں اوطان سے کہاں بنتی ہیں؟ مولانا فرماتے ہیں کہ "فی زماننا قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ لیکن یہ ایک قطعی غلط اور سراسر بے بنیاد دعویٰ ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی قوم وطن سے بنی ہو۔ آج اس زمانہ میں بھی دنیا کی تمام قومیں مولانا کے سامنے موجود ہیں۔ وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون سی قوم وطن سے بنی ہے؟ کیا امریکہ کے حبشی اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں؟ کیا جرمنی کے یہودی اور جرمن ایک قوم ہیں؟

کیا پولینڈ، روس، ترکی، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویا، چیکوسلوواکیا، لتھوانیا، فنلینڈ کسی جگہ بھی خاکِ وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی؟ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان میں وحدت کا رنگ محض خاکِ وطن نے پیدا کیا ہے؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ یہودی جو روئے زمین کے اطراف و اکناف میں منتشر ہیں کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہو گئے؟ کیا یورپ کے مختلف ممالک میں جرمن، مگیار، سلافی، موراوین وغیرہ مختلف قومی اقلیتیں کسی جگہ بھی وطنی رشتۂ اشتراک میں گم ہوئیں؟ واقعات تو بہرحال واقعات ہیں۔ آپ ان کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بنا سکتے۔ آپ کو یہ کہنے کا حق ہے، اگر آپ ایسا کہنا چاہیں، کہ اب قوموں کو اوطان سے بننا چاہیے۔ لیکن آپ کو ثبوت اور شہادت سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یہ غلط خبر دینے کا کیا حق ہے کہ اب قومیں اوطان سے بننے لگی ہیں؟ ھَاتُوا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ملک کے باشندوں کو باہر والے ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں، مثلاً امریکن، خواہ حبشی ہو یا فرنگی، باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے۔ مگر کیا اس سے یہ حقیقت بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم؟ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو۔ مثلاً اگر مولانا حسین احمد صاحب بیرون ہند تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنیلٹی" (برطانوی قومیت) سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت، حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی؟ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب (یعنی ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی وغیرہ) ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں"؟ شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے کے لیے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیے جیسے وہ شمار کیے جاتے ہیں۔

لغت اور قرآن سے غلط استدلال

اس کے بعد مولانا لغت عرب کی طرف رجوع فرماتے ہیں، اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت"، یا "مردوں اور عورتوں کا مجموعہ"، یا "ایک شخص کے اقربا"، یا "دشمنوں کی جماعت"۔ اس کا ثبوت انھوں نے آیات قرآنی سے بھی پیش فرمایا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی کی یا مسلمانوں کی "قوم" قرار دیا گیا ہے جو صریحاً تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یا وہ آیات جن میں

لفظ قوم پہلے یا دوسرے معنی میں مستعمل ہوا ہے لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث در پیش ہے وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ جواہر لال اور سید محمود لغت عرب اور قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ نہ کانگریس کی کارروائیوں میں یہ پرانی زبان استعمال ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ کا تو وہی مفہوم ہے اور وہی ہو سکتا ہے جو آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں "قوم" اور "قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ Nation اور Nationalism کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں جن کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" (International Relations) میں بدیں الفاظ کی ہے:-

"ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کو چند مخصوص جذبات (Sentiments) نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقت ور جاذبے تو دو ہیں۔ ایک جاذبۂ نسل۔ دوسرا جاذبۂ دین۔ لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی، اور زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد، اور مشترک رسوم و عوائد، مشترک تخیلات و افکار، اور مشترک مقاصد اور حوصلوں کا بھی اس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ کبھی یہ سب رابطے یکجا موجود ہوتے ہیں اور مجموعۂ افراد کو بستہ و پیوستہ رکھتے ہیں۔ اور کبھی ان میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے۔" (صفحہ ۱۱۶)

اسی کی تشریح "اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف" (Encyclopaedia of Religion and Ethics) میں یوں کی گئی ہے:-

قومیت وہ وصف عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے..... ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات، مشترک مفاد، مشترک عادات و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں، اور ان سب سے زیادہ اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بلا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ

وابستہ ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان مختلف حیثیات سے الفت و موانست ہوتی ہے۔ غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی دلچسپیاں اور اس کی عادات انھیں نرالی معلوم ہوتی ہیں، اور ان کے لیے اس کے انداز طبیعت اور اس کے خیالات و جذبات کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانے کے لوگ غیر قوم والوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اسی وجہ سے آج کا مہذب آدمی بھی غیر قوم والے کی عادات اور طرز زندگی کو اپنے مذاق کے خلاف پا کر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔"

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کا ایک قومیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے؟ یا کوئی نبی دنیا میں کبھی اس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اس معنی میں ایک قوم بنا دے؟ اگر نہیں تو یہ فضول لغوی بحث آخر کیوں چھیڑی جاتی ہے؟ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بارہا بدلتا ہے۔ کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رو سے" قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر کا ہو سکتا ہے"، درآنحالیکہ قومیت کا جو مفہوم قرآن کی زبان میں تھا اس کو آج کے مفہوم سے ذرہ برابر کوئی علاقہ نہیں۔ متقدمین نے "مکروہ" اور "حرام" میں اصطلاحی فرق نہیں کیا تھا اس لیے اکثر مقامات پر ان کی عبارتوں میں مکروہ بمعنی حرام مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اب کہ ممنوعیت کے ان دونوں مدارج کے لیے الگ اصطلاحیں بن چکی ہیں، اگر کوئی شخص کسی حرام کو محض مکروہ بمعنی اصطلاحی ٹھیرائے اور حجت کے طور پر سلف کی کوئی عبارت پیش کرے تو کیا یہ مغالطہ کے سوا کچھ اور ہوگا؟ اسی طرح لفظ قومیت بھی اب اصطلاح بن چکا ہے۔ اب مسلم و کافر کے لیے مشترک قومیت کا لفظ استعمال کرنا، اور معترض کا منہ بند کرنے کے لیے اس لفظ کے پرانے استعمالات کو حجت میں پیش کرنا بھی محض ایک مغالطہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور لفظی مغالطہ آگے چل کر مولانا دعویٰ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی، اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد حضور اکرم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کے ہاتھ آگیا کہ

وان یھود بنی عوف امۃ مع المومنین	بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ "ایک امت" ہوں گے۔

بس یہ فقرہ کہ "یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے"، یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے۔ لغت عرب میں امت سے مراد ہر وہ جماعت ہے، جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز۔ اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک امت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:۔

وقوله فی الحدیث ان یھود بنی عوف امۃ من المومنین یرید انھم بالصلح الذی وقع بینھم وبین المومنین کجماعۃ منھم کلمتھم وایدیھم واحدۃ	حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ان یھود بنی عوف امۃ من المومنین، اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہوگئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے

اس لغوی "امت" کو آج کی اصطلاحی "متحدہ قومیت" سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد (Military alliance) کہہ سکتے ہیں۔ یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی، البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے، اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تحالف کا خاتمہ ہوگیا اور مسلمانوں نے کچھ یہودیوں کو جلاوطن اور کچھ کو ہلاک کر دیا۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے؟ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اُس "متحدہ قومیت" سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرض بحث میں ہے؟ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا؟ کیا وہاں کوئی مشترک مجلس قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں سے جس کی اکثریت ہوگی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اسی کے منظور کیے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے؟ کیا وہاں مشترک عدالتیں قائم ہوئی تھیں جن میں یہودیوں اور

مسلمانوں کے قضایا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو؟ کیا وہاں کوئی وطنی کانگریس بنائی گئی تھی جس میں یہودی اکثریت کا منتخب کیا ہوا ہائی کمانڈ اپنی انگلیوں پر یہودی اور مسلمان سب کو رقص کراتا ہو؟ کیا وہاں رسول اللہ سے معاہدہ کرنے کے بجائے کعب بن اشرف اور عبداللہ بن ابی براہ راست افراد مسلمین سے ماس کانٹیکٹ کرنے گئے تھے؟ کیا وہاں وردھا اسکیم کے طرز کی کوئی تعلیمی اسکیم تصنیف کی گئی تھی تاکہ مسلمان اور یہودی بچے ایک مشترک سوسائٹی بنانے کے لیے تیار کیے جائیں اور ان کو یہودیت اور اسلام کی صرف مشترک سچائیاں ہی پڑھائی جائیں؟ کیا وہاں بھی کسی ابورافع نے کوئی "صومعہ اسکیم" تمام اہل مدینہ کے لیے بنائی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلیمی صومعوں میں مسلمان بچوں کا بھیجا جانا قبول فرمالیا تھا؟ مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسولِ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آج کل کی "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی میں سے کونسا عنصر پایا جاتا تھا؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے، اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی باز پرس کا خوف نہیں کہ محض امۃ من المومنین یا امۃ مع المومنین کے الفاظ معاہدۂ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کانگریس بنا رہی ہے ویسی ہی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے ہیں لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ؟ الفاظ کا سہارا لے کر مولانا نے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش تو بہت خوبی کے ساتھ کردی، مگر انھیں یہ خیال نہ آیا کہ حدیث کے الفاظ کو مفہوم نبوی کے خلاف کسی دوسرے مفہوم پر چسپاں کرنا، اور اس مفہوم کو نبی کی طرف منسوب کر دینا من کذب علی متعمداً کی زد میں آجاتا ہے۔ مولانا خود ایک جلیل القدر عالم اور محدث ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص حدیث عائشہ کان النبی صلعم یقبل و یباشر وھو صائم۔ کے لفظ مباشرت کو اردو کے معروف معنوں میں لے لے اور اس سے یہ استدلال کرے کہ روزے میں مباشرت کرنا نعوذ باللہ سنت سے ثابت ہے۔ لہٰذا سب مسلمانوں کو روزے میں مباشرت کرنی چاہیے تو آپ اس پر کیا حکم لگائیں گے؟ دونوں استدلالوں کی نوعیت ایک ہے لہٰذا ان کا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ مستدل کی شخصیت کو دیکھ کر اس باب میں رعایت کی جائے۔ بلکہ اگر مستدل ان لوگوں میں سے ہے جن کی طرف

مسلمان اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں، تو معاملہ اور زیادہ اشد ہو جاتا ہے جب شفاخانے ہی سے زہر تقسیم ہونے لگے تو امن کہاں تلاش کیا جائے؟

بناء فاسد علی الفاسد پھر مولانا اس متحدہ قومیت کے جواز میں ایک اور دلیل پیش فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے:-

"ہم روزانہ مفاد ہائے مشترکہ کے لیے ہیأت اجتماعیہ بناتے ہیں اور ان میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان کی ممبری اور شرکت کے لیے انتہائی جدوجہد کرتے ہیں ..... ٹاؤن ایریا، نوٹیفائیڈ ایریا، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلیاں، ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اس قسم کی سینکڑوں انجمنیں اور ایسوسی ایشنیں ہیں جو کہ انہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ خاص مقصد کے ماتحت ہیئت اجتماعیہ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ ان میں حصہ لینا اور مکمل یا غیر مکمل جدوجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا مگر اسی قسم کی کوئی انجمن اگر آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم ہو تو وہ حرام خلاف دیانت، خلاف تعلیمات اسلامیہ اور خلاف عقل و دانش وغیرہ ہو جاتی ہے۔" (صفحہ ۱۴)

یہ بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ ایک گناہ کو جائز فرض کر کے اس کی حجت پر مولانا اسی قسم کے دوسرے گناہ کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دونوں میں ایک ہی علت حرمت پائی جاتی ہے اور مقیس و مقیس بہ دونوں ناجائز ہیں تاوقتیکہ یہ علت اُن سے دور نہ ہو۔ علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں، میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے ایسے کہ ان کی تحلیل و تحریم حقیقت نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی ہے نہیں، محض گاندھی جی کی جنبش لب کے ساتھ ان کا فتویٰ گردش کیا کرتا ہے لیکن میں اسلام کے غیر تغیر پذیر اصولوں کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ ہر اس اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گناہ تھا، آج بھی گناہ ہے اور ہمیشہ گناہ رہے گا جس کا دستور انسانوں کو اس امر کا اختیار دیتا ہو کہ وہ اُن مسائل کے متعلق قانون بنائیں یا ان مسائل کا تصفیہ کریں، جن پر خدا اور اس کا رسول پہلے اپنا ناطق فیصلہ دے چکا ہو۔ اور یہ گناہ اس صورت میں اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جبکہ ایسے اختیارات رکھنے والی

اجتماعی ہیئت میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو، اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر ہو۔ ان اجتماعی ہیئتوں کے حدود اختیار و عمل کو خدا کی شریعت کے حدود سے الگ کر دینا مسلمانوں کا اولین فرض ہے اور اصلی جنگ آزادی ان کے لیے یہی ہے۔ اگر یہ حدود الگ ہو جائیں تو بلاشبہ ہر اُس جماعت میں شریک ہونا اور پورا پورا تعاون کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہوگا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترک اغراض کے لیے بنائی جائے عام اس سے کہ وہ آزادی ملک کے لیے ہو یا انتظام مملکت کے لیے، یا معاشی و صنعتی کاروبار کے لیے لیکن جب تک حدود ایک دوسرے گڈمڈ ہیں، اشتراک و تعاون تو درکنار، ایسے دستور کے تحت زندگی بسر کرنا بھی مسلمانوں کے لیے گناہ ہے۔ اور یہ اجتماعی گناہ ہے جس میں من و توکی تمیز نہیں۔ ساری قوم اس وقت تک گناہ گار رہے گی جب تک کہ وہ اس دستور کو پارہ پارہ نہ کر دے۔ اور اس میں ان لوگوں کا گناہ شدید تر ہوگا جو اس دستور پر راضی ہوں گے اور اسے چلانے میں حصہ لیں گے۔ اور اس شخص کا گناہ شدید ترین ہوگا جو خدا کی شریعت اور اس کے رسول کی سنت کو اس کے لیے دلیل جواز بنائے گا، کائناً من کان۔

میرے نزدیک یہ نہ تفقہ ہے اور نہ تقویٰ کہ جس چیز میں ایک علت حرمت کی اور دوسری علت جواز کی بیک وقت پائی جاتی ہو، اس میں سے محض علتِ جواز کو الگ نکال کر حکم لگا دیا جائے اور علتِ حرمت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ آپ آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف جدوجہد کا نام تو جھٹ لے دیتے ہیں کہ اسے کون نہ جائز بلکہ فرض کہے گا۔ لیکن یہ نام لیتے وقت آپ کو یہ یاد نہیں آتا کہ جو انجمن آپ کے زعم کے مطابق آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، وہی انجمن اُس دستور کو قبول کرتی ہے، اُسے چلاتی ہے، اور اُسی کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے لڑ رہی ہے جو انسانی مجلس قانون ساز کو خدا کے قانون میں ترمیم کرنے کا اختیار دیتا ہے، جس کی رو سے خدا کا قانون اگر نافذ ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس وقت جبکہ اسے لیجسلیچر کی منظوری حاصل ہو جائے، جس کے تحت غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بنانے اور بگاڑنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ ان کے اخلاق، ان کی معاشرت اور ان کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت پر ہر قسم کے اثرات ڈال سکتی ہے۔ ایسے دستور کے ساتھ جو آزادی ملک حاصل ہوتی ہو، آپ اس کے پیچھے دوڑ سکتے ہیں، کیونکہ آپ کو صرف برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو۔ اسی لیے آپ ایسی

انجمن کے معاملہ میں صرف علت جواز ہی ڈھونڈھتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے، آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علت حرمت کو دفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں، اس لیے کہ ہم کو برطانوی اقتدار کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں۔ اس کا نام اگر کوئی برطانیہ پرستی رکھتا ہے تو رکھے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

افسوسناک بے خبری مولانا ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"متحدہ وطنی قومیت، کی مخالفت کا فتوی صرف اس بنا پر کہ وطنیت کا مفہوم مغرب کی اصطلاح میں آج ایسے اصولوں پر اطلاق کیا جاتا ہے جو کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یکسر مخالف مذہب ہیں، اسی مفہوم مصطلح سے مخصوص ہوگا۔ مگر یہ مفہوم نہ عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے اور نہ اس کا کوئی مسلمان دیانت دار قائل ہو سکتا ہے اور نہ ایسے مفہوم کی اس وقت تحریک ہے۔ کانگریس اور اس کے کارکن اس کے محرک نہیں ہیں اور نہ اس کو ہم ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔"

(صفحہ ۴۱)

اس دعوے کے ثبوت میں وہی پامال چیز پھر سامنے لائی گئی ہے جس کی حقیقت ایک سے زیادہ مرتبہ کھولی جا چکی ہے، یعنی "بنیادی حقوق" کا اعلان اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ:۔

"خود کانگریس بھی جس متحدہ قومیت کو ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتی ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں چاہتی جس سے اہل ہند کے مذاہب یا ان کے کلچر و تہذیب اور پرسنل لا پر کسی قسم کا ضرر رساں اثر پڑے۔ وہ فقط انہی امور کو درست کرنا اور سلجھانا چاہتی ہے جو کہ مشترک مفاد اور ضروریاتِ ملکیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو پردیسی حکومت نے اپنے قبضہ میں لے کر عام باشندگانِ ہند کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ عموماً یہ امور وہی ہیں جو کہ ٹاؤن ایریا، نوٹیفائڈ ایریا، میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں وغیرہ میں داخلی اور خارجی حیثیات سے طے کیے جاتے ہیں۔ ان میں کسی قوم یا مذہب

کا دوسری قوم یا مذہب میں جذب ہو جانا ملحوظ نظر نہیں ہے۔" (صفحہ ۵)

یہ تحریر ایک روشن نمونہ ہے اس امر کا کہ اس نازک وقت میں کیسی سطح بینی اور کیسی سہل انگاری کے ساتھ مسلمانوں کی پیشوائی کی جا رہی ہے۔ جن مسائل پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ہے، جن میں ایک ذراسی چوک بھی قوم کی آئندہ صورتِ اجتماعی و اخلاقی کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ کر دے سکتی ہے، ان کے تصفیہ کو ایسا ہلکا اور آسان کام سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے اُتنے مطالعہ اور غور و خوض اور تدبر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی جس کا اہتمام ایک فردِ واحد کو طلاق اور وراثت کا کوئی جزئی مسئلہ بتانے میں کیا جاتا ہے۔ عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگریس کے مقصد و مدعا کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انہوں نے غور کیا ہے، نہ ان کو یہ خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں ان کے حدودِ اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کس طرح اور کن کن راہوں سے اُس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں جس کو تہذیب و تمدن اور عقائد و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے ـــــ اور یہ بات میں خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں ـــــ کہ مولانا باایں ہمہ علم و فضل کلچر، تہذیب، پرسنل لا وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی ان حضرات کو یقیناً بہت بری معلوم ہوگی جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں، اور اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔ مگر میں جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائی کی مسندِ مقدس سے مسلمانوں کی غلط رہنمائی کی جا رہی ہے، ان کو حقائق کے بجائے اوہام کے پیچھے چلایا جا رہا ہے، اور خندقوں سے بھری ہوئی راہ کو شاہراہِ مستقیم بتا کر انہیں اس کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تو میں کسی طرح اس پر صبر نہیں کر سکتا، کوشش بھی کروں تو میرے اندر اس پر صبر کی طاقت نہیں ہے، لہٰذا مجھے اس پر راضی ہو جانا چاہیے کہ جو کوئی میری صاف گوئی پر ناراض ہوتا ہو ہو جائے وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللہِ۔

وطنی قومیت کا حقیقی مدعا | معنی قومیت کی تشریح کے لیے اُن عبارات پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے جو اسی مضمون میں

لارڈ برائس کی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" اور "اخلاق وادیان کی دائرۃ المعارف" سے نقل کی گئی ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے افراد کو قوم بنانے والی چیز اصلاً اور ابتداءً ایک ہی ہے اور وہ کوئی ایسا جاذبہ ہے جو ان سب میں روح بن کر پھیل جائے اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کردے لیکن محض اس جاذبہ کا موجود ہونا قوم بنانے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کو اتنا طاقت ور ہونا چاہیے کہ وہ تمام اُن داعیات کو دبا دے جو افراد کو، یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے ہوں۔ اس لیے کہ علٰحدہ کرنے والی چیزیں اگر اس جوڑنے والے جاذبہ کی مزاحمت کرنے کے لیے کافی مضبوط ہوں تو وہ جوڑنے کے عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتا، یا بالفاظ دیگر "قوم" نہیں بنا سکتا۔ علاوہ بریں تشکیل قومیت کے لیے زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم وعادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار اور تخیلات، معاشی مفاد اور مادّی اغراض کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہونی چاہئیں جو اس جوڑنے والے جاذبہ کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں، یعنی ان کے اندر کوئی عنصر ایسا نہ ہو جو علٰحدگی کے احساس کو زندہ رکھنے والا ہو، اس لیے کہ یہ سب کی سب ایسی طاقتیں ہیں جو افراد کو مجتمع کرنے میں اثر رکھتی ہیں اور یہ جوڑنے کے عمل میں اس کلمۂ جامعہ کی مددگار صرف اسی طرح ہو سکتی ہیں کہ ان سب کا میلان اسی مقصود کی طرف ہو جو اس کلمۂ جامعہ کا مقصود ہے۔ ورنہ بصورت دیگر یہ دوسرے ڈھنگ پر جماعت سازی کریں گی اور قوم بنانے کا عمل ناقص رہ جائے گا۔

اب غور کیجیے کہ جس ملک میں اس معنی کے لحاظ سے مختلف قومیں رہتی ہوں ان کو متفق کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔ آپ جتنا بھی غور کریں گے، آپ کو صرف دو ہی ممکن العمل صورتیں نظر آئیں گی:۔

ایک یہ کہ ان قوموں کو ان کی قومیتوں کے ساتھ برقرار رکھ کر ان کے درمیان واضح اور متعین شرائط کے ساتھ ایک ایسا وفاقی معاہدہ ہو جائے جس کی رو سے وہ صرف مشترک اغراض ومقاصد کے لیے مل کر عمل کریں اور باقی امور میں بالفعل خود مختار ہوں۔ کیا کانگریس نے فی الواقع یہ طریقہ اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان قوموں کو "ایک قوم" بنا دیا جائے۔ یہی دوسری صورت کانگریس چاہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قومیں ایک قوم کس طرح بن سکتی ہیں؟ لامحالہ ان کے لیے سب سے پہلے تو ایک مشترک جاذبہ،

ایک جامع کلمہ درکار ہے، اور وہ جاذبہ یا کلمہ صرف تین چیزوں ہی سے مرکب ہو سکتا ہے: وطن پرستی، بیرونی دشمن سے نفرت اور معاشی مفاد سے دلچسپی۔ پھر جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، قوم بنانے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ یہ جاذبہ اتنا قوی ہو کہ دوسرے تمام جاذبے جنھوں نے ان قوموں کو الگ الگ اقوام بنا رکھا ہے اس کے سامنے دب جائیں۔ کیونکہ اگر مسلمان کو اسلام سے، ہندو کو ہندویت سے، سکھ کو سکھیت سے اتنی دلچسپی ہو کہ جب مذہب یا قومیت کا معاملہ سامنے آئے تو مسلمان، مسلمان کے ساتھ، اور ہندو ہندو کے ساتھ اور سکھ سکھ کے ساتھ جڑ جائے اور اس قومی (یا وطن پرستوں کی زبان میں فرقہ وارانہ) معاملہ کی حمایت کے لیے ایک جماعت بن کر اٹھ کھڑا ہو، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاذبۂ وطن نے ان کو ایک قوم نہیں بنایا۔ یہ امر دیگر ہے کہ مسلمان اسلام کا قائل رہے اور نماز بھی پڑھ لیا کرے، اور ہندو، ہندویت کا معتقد رہے اور مندر بھی چلا جایا کرے، لیکن ایک قوم بننے کے لیے شرط اوّل یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں وطنیت کی کم از کم اتنی اہمیت ضرور ہو کہ اسلام کو اور ہندویت یا سکھیت کو وہ اس پر قربان کر سکتا ہو۔ اس کے بغیر "وطنی قومیت" قطعاً بے معنی ہے۔

یہ تو وطنی قومیت کا تخم ہے۔ مگر یہ تخم بارآور نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے مناسب آب و ہوا، مناسب زمین اور مناسب موسم نہ ہو۔ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ جاذبۂ قومی کی مدد کے لیے ضروری ہے کہ زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم و عادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار اور تخیلات، معاشی اغراض اور مادّی مفاد، غرض تمام وہ چیزیں جو انسانی جماعتوں کی تالیف و ترکیب میں فی الجملہ اثر رکھتی ہیں، اسی ایک جاذبۂ قومی کی فطرت میں ڈھلی ہوئی ہوں۔ اس لیے کہ افراد کو جوڑنے والی ان مختلف طاقتوں کا میلان اگر علیحدگی کی جانب ہو تو یہ جذب اور تالیف اور اجتماع کے عمل میں اس جاذبہ کی الٹی مزاحمت کریں گی اور متحد قوم نہ بننے دیں گی۔ لہٰذا ایک وطنی قوم بنانے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ان سب چیزوں میں سے اُن عناصر کو نکالا جائے جو مختلف قوموں کے اندر جداگانہ قومیت کی روح پیدا کرتے اور زندہ رکھتے ہیں، اور ان کے بجائے ایسے رنگ میں ان کو ڈھالا جائے کہ وہ آہستہ آہستہ تمام افراد اور طبقوں اور گروہوں کو ہم رنگ کر دیں، ان کو ایک سوسائٹی بنا دیں، ان کے اندر ایک مشترک

اجتماعی مزاج اور مشترک اخلاقی روح پیدا کردیں، ان کے اندر ایک طرح کے جذبات و احساسات پھونک دیں، اور ان کو ایسا بنا دیں کہ ان کی معاشرت ایک ہو، طرز زندگی ایک ہو، ذہنیت اور انداز فکر ایک ہو، ایک ہی تاریخی سرچشمے سے وہ افتخار کے جذبات اور روح کو حرکت میں لانے والے محرکات حاصل کریں، اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کسی چیز میں بھی کوئی نرالاپن باقی نہ رہے۔

اسی مقصد کے لیے وردھا اسکیم بنائی گئی ہے اور یہی مقصد ودیا مندر اسکیم کا ہے، جیسا کہ دونوں اسکیموں میں صاف صاف لکھ بھی دیا گیا ہے۔ مگر مولانا نے ان اسکیموں اور ان کے نصاب کو نہیں دیکھا۔ اسی قومیت کا صور برسوں سے پنڈت جواہر لال پھونک رہے ہیں مگر ان کی بھی کوئی تحریر و تقریر مولانا کی سماعت و بصارت تک پہنچنے کا موقع نہ پا سکی۔ یہی چیز کانگریس کا ایک ایک ذمہ دار آدمی کہہ رہا ہے، لکھ رہا ہے، اور اس کے لیے اُن حاکمانہ طاقتوں سے کام لے رہا ہے جو نئے دستور نے عطا کی ہیں، مگر نہ مولانا کے کان ان باتوں کو سنتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں ان چیزوں کو دیکھتی ہیں۔ اسی چیز کے لیے ان تمام اجتماعی ہیئتوں اور مجلسوں سے کام لیا جا رہا ہے جن کی فہرست مولانا بار بار گنایا کرتے ہیں، اور یہ مجالس محض اس وجہ سے اس کام میں ان کی مددگار بن گئی ہیں کہ ان کا دائرۂ عمل ان تمام معاملات پر چھایا ہوا ہے جن کو آپ تہذیب، کلچر، پرسنل لا وغیرہ ناموں سے یاد فرماتے ہیں۔ مگر یہ عمل جو ہر آن ہندوستان کے ہر حصہ میں ہو رہا ہے اس کی بھی کسی جنبش کو مولانا کے حواس خمسہ تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ اس پورے مواد میں سے صرف ایک ہی دستاویز ان تک پہنچی ہے جس کا نام "بنیادی حقوق" ہے اور بس اُسی کے اعتماد پر مولانا اس "متحدہ قومیت" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں، حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت ملکۂ وکٹوریہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغربی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسولِ پاک کے عمل سے جوڑنے کی جسارت ہم جیسے گناہ گاروں کے بس کی بات تو نہیں ہے۔ ہاں جن کے پاس تقویٰ کا زاد راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بھی بخشش کی امید رکھتے ہیں، انھیں اختیار ہے کہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔

اشتراک لفظی کا فتنہ مولانا نے اپنے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے جس کے حدود انھوں نے تمام شرعی شرائط کو ملحوظ رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں، اور انکو وہ ایسی پُر احتیاط مفتیانہ زبان میں بیان فرماتے ہیں کہ قواعد شرعیہ کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لا سکے لیکن اس میں خرابی بس اتنی ہی ہے کہ اپنے مفہوم ذہنی کو مولانا کانگریس کا مفہوم و مدعا قرار دے رہے ہیں حالانکہ کانگریس اس سے بمراحل دور ہے۔ اگر مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "متحدہ قومیت" سے میری مراد یہ ہے، تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ نہیں، کانگریس کی مراد بھی یہی ہے، اور کانگریس بالکل نبی صلعم کے اسوہ پر چل رہی ہے، اور مسلمانوں کو مامون و مطمئن ہو کر اپنے آپ کو اُس متحدہ قومیت کے حوالہ کر دینا چاہیے جسے کانگریس بنانا چاہتی ہے۔ یہیں سے ہمارے اور ان کے درمیان نزاع کا آغاز ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ "پانی ڈالنے" سے آپ کا مفہوم ذہنی "پانی ڈالنا" ہی ہو، لیکن دوسرے نے "آگ لگانے" کا نام "پانی ڈالنا" رکھ چھوڑا ہو، تو آپ کتنا ظلم کریں گے اگر اختلاف معنی کو نظر انداز کر کے لوگوں کو مشورہ دینے لگیں کہ اپنا گھر اس شخص کے حوالہ کر دو جو "پانی ڈالنے" کے لیے کہتا ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے تو قرآنِ مجید میں ہدایت کی گئی تھی کہ جب ایک لفظ ایک صحیح معنی اور ایک غلط معنی میں مشترک ہو جائے اور تم دیکھو کہ اعدا دین اس اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھا کر فتنہ برپا کر رہے ہیں تو ایسے لفظ ہی کو چھوڑ دو۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (بقرہ۔ ۱۳) لہٰذا مولانا کو اپنے مفہوم ذہنی کے لیے تحالف، یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا چاہیے تھا، اور اس وفاق یا تحالف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے تھا، نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگریس کا عمل ہے۔ کم از کم اب وہ امت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمالیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امرا اور فاسق اہلِ سیاست نے جو کچھ کیا اس کو علما کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال فراہم کر دی۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

ہندوستان کا مجدد اعظم

اور

ماہنامہ "الفرقان" کا مجدد الف ثانی نمبر

(مسلمانانِ ہند کے مذہبی و سیاسی اختلافات کا ناطق فیصلہ)

حضرت امام ربانی مجددِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات قدسی صفات پر سرزمین ہند جس قدر بھی ناز کرے کم ہے آپ پیغمبر نہ تھے لیکن آپکا اندازِ دعوت و اصلاح پیغمبرانہ تھا۔ آپکے دورِ زندگی میں ہندوستان کے مذہبی و سیاسی حالات قریب قریب بالکل ویسے ہی تھے جن میں آج اسلامیانِ ہند گھرے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے جس ربانی ہدایت و انشراحِ صدر سے کام لیکر اُن نامساعد حالات کا مقابلہ کیا تھا آج بھی اس روشنی راہ کو فراہم کر کے ملتِ اسلامیہ کا تحفظ اور شریعتِ الٰہیہ کا احیا کیا جائے انہیں حالات کے پیشِ نظر ادارہ "الفرقان" نے "مجدد نمبر" شائع کیا ہے جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ ماہِ شوال میں شائع ہوا تھا۔ ادارہ نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اُس کی تیاری میں حصہ لیا الحمد للہ کہ ملک کے اکابر علماء و مشائخ، مشاہیر اہل قلم و اربابِ تحقیق کے بلند پایہ مقالات اور محققانہ مضامین کا غیر معمولی سرمایہ فراہم ہو چکا ہے اور یقین ہے کہ یہ نمبر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات، کمالات، ملفوظات و مقالات غرض آپ کی پوری زندگی کا نہایت آب دار و تابناک آئینہ ہو گا جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی تمام سوانح حیات سے بے نیاز بنا دے گا۔ اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت عہ (ایک روپیہ آٹھ آنہ) معمولی ایڈیشن کی قیمت عہ (ایک روپیہ)، مستقل خریداروں کو مفت دیا جائے گا، نئے خریداروں کو بھی مفت دیا جائے گا بشرطیکہ وہ چندہ خریداری جلد از جلد دفتر کو روانہ کر دیں۔

چندہ سالانہ "الفرقان" اعلیٰ ایڈیشن تین روپئے۔ معمولی دو روپئے (محصول ڈاک بذمہ خریدار)۔

المعلن مینیجر "الفرقان"۔ بریلی (یو۔ پی)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عنہ ۱۰	عشہ ۲۵	للعہ ۴۵	لتہ
نِصف صفحہ	ـے ۶	عشہ ۱۵	عشہ ۲۵	للعہ ۴۵
رُبع صفحہ	للعہ ۴	عنہ ۱۰	معہ ۱۷	عشہ ۲۵

۱ - کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲ - اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳ - صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴ - نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵ - ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔